اسلامیات اختیاری

9 - 10

پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

منظور کردہ وفاقی وزارت تعلیم (شعبہ نصاب سازی) حکومت پاکستان، اسلام آباد۔
مراسلہ نمبر 5-Gen/266/BISE مورخہ 22 اپریل 1976ء، اس کتاب کا کوئی حصہ نقل یا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا
اور نہ ہی اسے ٹیسٹ پیپر، گائیڈ بکس خلاصہ جات نوٹس یا امدادی کتب کی تیاری میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

مؤلفین:

☆ ڈاکٹر قاضی مجیب الرحمٰن الازہری (مرحوم)
☆ علامہ مرزا یوسف حسین
☆ پروفیسر رشید احمد
☆ پروفیسر عبدالحیٔ انور

ایڈیٹر:

☆ حافظ محمد اجمل مرحوم
☆ حافظ محمد اقبال

کمپوزنگ ☆ محمد کامران رفیق

پبلشرز:

پرنٹر:

کوڈ نمبر	ایڈیشن	طباعت	تعداد اشاعت	قیمت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

کتاب اسلامیات (اختیاری) مرکزی وزارت تعلیم، پاکستان کے مجوزہ نصاب کے مطابق مؤلفین نے تالیف کی۔ شیعہ وسنی علماء پر مشتمل مرکزی ریویو کمیٹی نے کتاب کے مسودے پر نظر ثانی کی اور ایڈیٹر ریویو کمیٹی کی تجاویز اور ترامیم کی روشنی میں کتاب کو مرتب کیا۔

کتاب اسلامیات (اختیاری) حکومت پاکستان کے مدبرانہ فیصلے کے مطابق شیعہ وسنی طلبہ کے لیے مشترک نصابی کتاب ہے اس میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے کہ کوئی بات کسی مسلک کے خلاف نہ ہو اور اسے پڑھنے کے بعد طلبہ میں:

ا۔ توحید و رسالت اور قیامت کا عقیدہ راسخ ہو۔

ب۔ دین اسلام کی اکملیت اور رسول کریم ﷺ کی محبت اور ختم نبوت کا نظریہ پختہ ہو۔

ج۔ آیاتِ قرآن کریم اور احادیثِ نبوی ﷺ کے پڑھنے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو۔

د۔ آپ ؐ کی سیرتِ طیبہ اور مقدس تعلیمات کو اپنانے کا جذبہ اجاگر ہو اور باعمل انسان بننے کی لگن پیدا ہو۔

یہ فیصلہ تو اساتذہ اور طلبہ ہی کریں گے کہ ہم ان مقاصد کی تکمیل میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ بہر حال اپنے طور پر کتاب کو معیاری، مفید اور آسان بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ رب کریم قبول فرمائے!

ایڈیٹر

حافظ محمد اجمل مرحوم

فہرست مضامین

موضوع	صفحہ
باب اوّل ۔ القرآن	**1**
فضیلتِ قرآن	1
آیاتِ توحید وصفاتِ باری تعالیٰ	7
آیاتِ رسالت وشانِ رسالتمآبؐ	11
آیاتِ ایمانیّات	18
آیاتِ قیامت (سورۃ انفطار)	19
آیاتِ احکام، آداب واخلاق	21
باب دوم ۔ الاحادیث النبویّہؐ	**38**
(پچّیس احادیث)	38
باب سوم ۔ تعلیماتِ اسلام	**54**
1- توحید	54
2- اطاعت رسُول کریم صلّی اللہ علیہ والہٖ وسلّم	57
3- طہارت و پاکیزگی	59
4- علم کی ترغیب	62
5- عدل	64
6- جہاد	68
7- اکلِ حلال	71
8- عفّت وحیا	75
9- سماجی انصاف	77
10- فرض شناسی	80
11- اسلامی عبادات کی امتیازی خصوصیّات	83
باب چہارم ۔ سیرتِ طیّبہؐ	**86**
افضل الرّسل صلّی اللہ علیہ والہٖ وسلّم	86
رِسالت کا مفہوم، منصب اوراس کی عظمت	87
اولوالعزم انبیاء علیہم السّلام کی تبلیغی مساعی	91
آنحضورؐ کی تکمیلِ فریضۂ رسالت	97
ا۔ مکّی دَور	97
ب۔ مدنی دَور	104
ختم نبوت	111
آنحضورؐ کا پاکیزہ کردار	113
ا۔ عہدِ طفولیّت	113
ب۔ عہدِ شباب	114
اخلاقِ نبوی صلّی اللہ علیہ والہٖ وسلّم	117
باب پنجم ۔ عربی زبان کی گرامر	**122**

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ

باب اوّل

القرآن

فضیلتِ قرآن:

اللّٰہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔اس نے انسانوں کو پیدا ہی نہیں کیا بلکہ ان کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے انھی میں سے کچھ نیک اور برگزیدہ بندے بھیجے۔ایسے بندوں کو نبی اور رسول کہتے ہیں۔رسولوں پر اللّٰہ تعالیٰ نے کتابیں نازل فرمائیں تا کہ ان کے دُنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی لوگ اللّٰہ تعالیٰ کی کتابوں سے ہدایت حاصل کرتے رہیں۔

قرآن مجید وہ مقدس کتاب ہے جو اللّٰہ تعالیٰ نے سید المرسلین خاتم النبیین حضرت محمد مصطفٰی ﷺ پر تھوڑی تھوڑی کر کے قریباً تیئس سال کے عرصے میں نازل کی۔اللّٰہ تعالیٰ کے مقرب فرشتے حضرت جبریل علیہ السلام قرآنی آیات لایا کرتے تھے۔

قرآن کریم اللّٰہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔جس طرح پیغمبروں میں حضرت محمد مصطفٰی ﷺ آخری پیغمبر ہیں کہ آپ ﷺ کے بعد نہ کوئی نبی آیا ہے اور نہ آئے گا' اسی طرح قرآن مجید کے بعد نہ کوئی کتاب نازل ہوئی ہے اور نہ ہوگی۔قیامت تک آنے والے لوگوں کو قرآن مجید سے رہنمائی حاصل کرنی ہوگی۔

لفظ قرآن قِرَاءۃٌ سے بنا ہے جس کے معنی پڑھنے کے ہیں۔قرآن کے معنی ہیں وہ چیز جو پڑھی جائے۔چونکہ یہ کتاب بار بار اور بکثرت پڑھی جاتی ہے اس لیے اس کا نام قرآن رکھا گیا۔

قرآن مجید بنی نوع انسان کے لیے رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہے۔یہ علم و حکمت کی کتاب ہے۔افراد و اقوام کی اصلاح کے لیے اس میں رہنما اصول بیان ہوئے ہیں جن پر عمل کر کے عرب قوم جو اس وقت تہذیب و تمدن سے نا آشنا تھی' انسانیت کے اعلیٰ اخلاق سے آراستہ ہوئی اور قیصر و کسریٰ کی شہنشاہیت کو ختم کر کے اسلام کا بول بالا کیا۔قرآن کریم میں دُنیا کی بہت سی قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں بیان ہوئی ہیں جو رہتی دُنیا تک اقوام عالم کے لیے درسِ عبرت بنی رہیں گی۔

قرآن مجید نے بنی نوع انسان کو امن و سلامتی کا پیغام اور حریت و مساوات کا درس دیا۔کالے اور گورے' عربی اور عجمی کا فرق ختم کر دیا۔علاقائی' نسلی اور لسانی تعصّبات کو مٹا کر ایک ایسے معاشرے کی بنیاد رکھی جس میں شرافت اور بزرگی کا معیار ذاتی عمل اور انفرادی سیرت و کردار قرار پایا۔حسب و نسب کی بنا پر معاشرے میں قائم شدہ امتیازات کو ختم کر کے شرافت اور عظمت کی بنیاد صرف تقویٰ اور اللّٰہ کے خوف پر رکھی۔

قرآن مجید نے عدل اور بے لاگ انصاف کا درس دیا۔صرف اپنوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ غیروں اور دشمنوں کے ساتھ بھی۔

قرآن مجید نیکی، راست بازی، دیانتداری اور نرم گفتاری کا مبلّغ ہے۔اس نے اپنے احکام اور پیغام کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔عرب جن کو اپنی زبان دانی پر ناز تھا عَش عَش کرنے لگے اور قرآن مجید کے بار بار چیلنج کے باوجود اس کے مقابلے میں ایک آیت بھی پیش نہ کر سکے۔اس کے نزول کو چودہ سو سال کا طویل عرصہ گزر گیا لیکن یہ کتاب ہر قسم کے ردّوبدل سے محفوظ ہے۔اس کا ایک ایک لفظ ایک ایک حرف بلکہ ایک ایک حرکت زمانہ نزول سے لے کر اب تک محفوظ ہے کیوں نہ ہو اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت اپنے ذمّے لی ہے' فرمایا:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ (الحجر: 9:15) ہم نے ہی قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

قرآن کریم دُنیا کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔آج دُنیا کے گوشے گوشے میں اور زمین کے چپے چپے میں کروڑوں انسان اس کو باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔دُنیا کی کوئی بھی کتاب اتنی کثرت سے نہیں پڑھی جاتی غرضیکہ قرآن مجید اپنے پیغام' اپنی زبان' اپنے اسلوبِ بیان اور طرزِ استدلال کے لحاظ سے بینظیر ہے۔اس کا پیغام انقلاب آفریں ہے۔اس کی زبان نہایت شیریں اور فصیح ہے کہ پڑھنے والا تھکتا ہی نہیں اور سننے والے پر عجیب وغریب کیفیت طاری ہوتی ہے۔

مضامینِ قرآن:

قرآن مجید میں بے شمار مضامین بیان ہوئے ہیں۔انسان کی رہبری کے لیے تمام ہدایات اس کتابِ الٰہی میں مذکور ہیں جن میں سے چند اہم عنوانات درج ذیل ہیں۔

1۔ عقائد:

عقائد کے سلسلے میں عقیدہ توحید کا بار بار ذکر ہوا ہے۔مختلف طریقوں سے یہ بات ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ اللہ ایک ہے۔اس کا کوئی شریک نہیں۔وہ سب کا خالق ہے۔زمین' آسمان' سورج' چاند' ستارے' دریا اور پہاڑ سب اسی نے بنائے ہیں۔جمادات' نباتات اور حیوانات سب اسی کی مخلوق ہیں۔وہ سب کا خالق ہی نہیں بلکہ محافظ بھی ہے۔وہ اپنی ذات اور صفات میں لاشریک ہے۔

قرآن مجید نے عقیدہ قیامت پر بھی خاصا زور دیا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ زندگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ موت کے بعد بھی ایک اور زندگی ہے جو اس عارضی دنیاوی زندگی کے برعکس دائمی اور ابدی ہے۔ایک دن تمام انسانوں کو جمع کیا جائے گا۔ان کا حساب لیا جائے گا اور ان کے اعمال کے مطابق ان کو جزا اور سزا دی جائے گی۔اس لیے انسان کو یاد رکھنا چاہیے کہ اسے ایک دن اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو کر جواب دہ ہونا ہے۔

قرآن مجید نے اس بات کا بھی کئی مقامات پر تذکرہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی ہدایت کی خاطر اپنے نیک بندوں کو نبی اور رسول بنا کر بھیجتا ہے تاکہ انسان ان کی پیروی میں راہ راست پر چل کر اعلیٰ مقام حاصل کریں چونکہ انبیا اور رسل علیہم السلام اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے ہوتے ہیں۔اس لیے ان پر بھی ایمان لانا ضروری ہوتا ہے کیونکہ ان پر ایمان لائے بغیر انسان خدا کے پیغام اور احکام کو نہیں پا سکتا۔یہی ہستیاں اللہ اور بندے کے درمیان واسطہ ہوتی ہیں۔چونکہ فرشتے اللہ کا پیغام لے کر انبیا علیہم السلام کے پاس آتے ہیں اس لیے ان کو بھی اللہ کی معصوم مخلوق کی حیثیت سے ماننا ضروری ہے۔یوں عقائد کے باب میں توحید' رسالت' قیامت' ملائکہ اور اللہ کی کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔

2۔عبادات:

قرآن مجید میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد کے متعلق بھی احکام بیان ہوئے ہیں۔خاص طور سے نماز، زکوٰۃ اور جہاد کے مسائل کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

3۔معاملات:

معاملات میں نکاح، طلاق، میراث، تجارت اور لین دین وغیرہ کے احکام شامل ہیں۔

4۔اخلاقیات:

قرآن مجید میں اجتماعی اور انفرادی اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے جن میں والدین کی اطاعت اور ان کے حقوق کی ادائیگی کو مختلف صورتوں میں بیان کیا گیا ہے۔اسی طرح میاں بیوی کے حقوق و فرائض اور رعایا اور حاکم کے حقوق بیان ہوئے ہیں۔ان کے علاوہ عدل، ایفائے عہد، صدق و امانت اور صبر و تحمل کا حکم دیا گیا ہے۔قتل، زنا، چوری، بغاوت، بہتان طرازی، شراب خوری، جوا اور غیبت سے منع کیا گیا ہے غرضیکہ تمام فضائل اور رذائل کے متعلق احکام موجود ہیں۔

5۔قصص:

قرآن کریم میں انبیائے کرام علیہم السلام اور ان کی امتوں کے واقعات بیان ہوئے ہیں تا کہ لوگ سبق حاصل کریں۔متعدد اقوام کا ذکر بھی ہوا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے طرح طرح کی نعمتوں سے نوازا لیکن وہ اپنی ناشکری اور بے راہ روی کے باعث عذابِ الٰہی کی مستحق ہوئیں اور انھیں صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔
اس کے علاوہ حضور ﷺ کے فضائل اور مناقب کا تذکرہ بھی قرآن کریم میں جگہ جگہ ملتا ہے اور لوگوں کو آپ ﷺ کے اتّباع کی تاکید کی گئی ہے۔اسی طرح کائنات کی تخلیق اور اس میں تدبّر اور غور و فکر کی دعوت بھی قرآن کریم کا خاص عنوان ہے۔

آدابِ تلاوتِ قرآن

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ لفظ قرآن قراءۃ سے بنا ہے جس کے معنی پڑھنے کے ہیں۔قرآن و حدیث میں اس کتابِ الٰہی کی تلاوت پر زور دیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ط (المزمّل:20:73) ''پس تم سے جتنا قرآن آسانی سے پڑھا جا سکے پڑھ لیا کرو۔''

احادیث میں بھی تلاوتِ قرآن کریم کی بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے اور تلاوت پر مداومت کی تاکید کی گئی ہے۔ایک حدیث میں ہے ''میری امت کی سب سے افضل عبادت تلاوتِ قرآن کریم ہے''۔قرآن کریم کی تلاوت کا بہت زیادہ ثواب ہے۔حدیث شریف میں ہے جو شخص قرآن کا ایک حرف تلاوت کرے گا اسے دس نیکیوں کا ثواب ملے گا۔آپ ﷺ نے اسی حدیث میں یہ بھی واضح فرما دیا ہے کہ الـــم

ایک حرف نہیں بلکہ الف ایک حرف، لام ایک اور حرف اور میم ایک اور حرف ہے۔

تلاوتِ قرآن کریم کے سلسلے میں یہ امر پیش نظر رہنا چاہیے کہ قرآن حکیم نہایت اہم اور مقدّس کتاب ہے اس لیے کہ یہ خالقِ ارض وسما کی کتاب ہے جسے اگر پہاڑوں پر نازل فرما دیا جاتا تو وہ لرز اٹھتے۔ اس لیے اسے عام کتابوں کی طرح نہیں پڑھا جاتا بلکہ اس کے پڑھنے کے مخصوص آداب ہیں جن کو مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔

1۔پاکیزگی:

اس کتاب کو ہاتھ لگانے سے پہلے پاک اور صاف ہونا ضروری ہے۔ وضو کر کے ہی اسے چُھوا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (الواقعہ:79:56) ''اسے سوائے پاک لوگوں کے اور کوئی نہ چھوئے''۔

اس کی تلاوت کے وقت پاک اور صاف جگہ پر بیٹھنا بھی ضروری ہے۔

2۔تعوّذ اور تسمیہ:

تلاوت کرنے سے پہلے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ط بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھنا چاہیے۔ بِسْمِ اللّٰهِ پڑھنے کا حکم حدیث شریف میں ہے کہ کوئی اہم کام جو اللّٰہ کا نام لے کر شروع نہ کیا جائے برکت سے خالی ہوتا ہے مگر تَعَوُّذ کے بارے میں رب تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِo (النحل:98:16) ''پس جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان مردود کے شر سے اللّٰہ کی پناہ مانگ لیا کرو (یعنی تعوذ پڑھ لیا کرو)''۔

بغیر کسی ضروری کام کے تلاوت کے دوران کسی سے گفتگو کرنا یا جگہ سے اٹھنا مناسب نہیں۔ البتہ کوئی خاص ضرورت ہو تو بات کی جا سکتی ہے اور پھر تَعَوُّذ اور تسمیہ پڑھ کر تلاوت شروع کرنی چاہیے۔ دوسرے لوگوں کو بھی چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو تلاوت کرنے والے کی تلاوت میں خلل نہ ڈالیں اور اس کی توجہ نہ ہٹائیں۔

3۔ترتیل:

قرآن مجید کو جلد جلد نہیں بلکہ اطمینان اور آرام کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا چاہیے اس طرح کہ ایک ایک حرف صحیح طریقے سے ادا ہو جائے۔ اللّٰہ کا حکم ہے۔

وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا (المزّمل:4:73) ''اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھیے''۔

4۔احتیاط:

قرآن کریم کے پڑھنے میں زبر، زیر، پیش کی بڑی احتیاط کرنی چاہیے کیونکہ زیر زبر کے فرق سے معانی کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں بلکہ بہت سے ایسے مقامات ہیں جہاں حرکات کی تبدیلی سے معانی اس قدر بدل جاتے ہیں کہ نوبت کفر و شرک تک جا پہنچتی ہے۔

5۔رموز اوقاف:

اعراب کی احتیاط کے علاوہ قرآن مجید کی تلاوت میں ایک ضروری امر یہ بھی ہے کہ کہاں رکا جائے اور کہاں نہ رکا جائے۔کس مقام پر سانس توڑے بغیر تلاوت جاری رہے اور کس جگہ سانس توڑ دینا ضروری ہے۔ پڑھنے والوں کی آسانی کی خاطر علماء نے کچھ علامتیں مقرر کی ہیں جنھیں رموز اوقاف کہتے ہیں۔

صحیح طریقے سے قرآن پڑھنے کے لیے ان رموز اوقاف کو سمجھنا اور تلاوت کرتے وقت ان کی پابندی کرنا نہایت ضروری ہے ورنہ اکثر مقامات پر معانی بدل جانے کا احتمال ہے۔

6۔جہرواخفا:

یہ پڑھنے والے کی مرضی پر منحصر ہے کہ تلاوت آواز بلند کرے یا نیچی آواز میں قرآن کریم پڑھے لیکن بلند آواز سے پڑھتے وقت یہ دیکھ لینا چاہیے کہ ایسی تلاوت سے کسی کو تکلیف تو نہ ہوگی کیونکہ جب قرآن بلند آواز سے پڑھا جائے تو دوسرے لوگوں پر اس کا سننا اور خاموش رہنا ضروری ہوجاتا ہے۔قرآن کریم میں ہے۔

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○ (الاعراف:204:7)

اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے خوب غور سے سنو اور خاموش ہوجاؤ تاکہ تم پر رحمت ہو۔

اس لیے اگر کوئی شخص قریب سویا ہوا ہو یا نماز پڑھ رہا ہو یا کسی ایسے کام میں مصروف ہو جسے وہ چھوڑ کر قرآن مجید کے سننے کی طرف ہمہ تن مشغول نہیں ہوسکتا تو پھر اونچی آواز سے پڑھنا مناسب نہیں۔گھروں میں جہاں بہت سے لوگ رہتے ہیں بہتر ہے کہ تلاوت نیچی آواز سے کی جائے۔

7۔خوش الحانی:

قرآن مجید کو خوش الحانی سے پڑھنا چاہیے لیکن اسے گا کر پڑھنا جس سے قرآن کا تقدس مجروح ہو جائز نہیں۔

8۔مقدارِ تلاوت:

تلاوت تھوڑی ہی کی جائے لیکن اچھی طرح اور باقاعدگی کے ساتھ کرنی چاہیے۔جس قدر آسانی کے ساتھ پڑھا جاسکے پڑھے۔کم ازکم اتنا پڑھے کہ سال میں دومرتبہ قُرآن ختم ہوجائے۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اگر سال میں دومرتبہ قُرآنِ کریم ختم ہوگیا تو حق ادا ہوگیا کیونکہ حضرت جبریل علیہ السلام نے حضور ﷺ کے ساتھ آپ ﷺ کی عمر کے آخری سال قُرآنِ کریم دومرتبہ دہرایا تھا۔

ان ظاہری آداب کے علاوہ درج ذیل باتوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔

1۔تدبّر:

قرآن مجید علم ودانش کی کتاب ہے اس لیے اسے سرسری طور پر پڑھ لینا کافی نہیں۔تلاوت کا ثواب ضرور ہے لیکن قرآن مجید سے حقیقی

فائدہ اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب کہ اس کے معانی اور مطالب میں غور وخوض کیا جائے اس لیے حتی المقدور قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور کسی عالمِ دین سے سبقاً سبقاً پڑھنا چاہیے۔

2۔تقویٰ:

قرآن مجید سے حقیقی معنوں میں مستفیض وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو متقی اور پرہیزگار ہوں۔ دوسرے لوگ اس سے کما حقہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس امر کی طرف سورہ بقرہ کے آغاز میں هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ کہہ کر اشارہ فرمایا گیا ہے۔

تلاوت کرتے وقت یہ بات ذہن سے ہرگز اوجھل نہ ہونی چاہیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جو اس نے اپنے حبیب حضرت محمد ﷺ پر نازل فرمائی ہے۔ اس کے ادب و احترام اور اس کے احکام کی پابندی ہی میں ہماری فلاح اور کامرانی مضمر ہے اور اس سے سرتابی سراسر نقصان اور خسارے کا موجب ہے۔

سوالات

1۔ فضیلتِ قرآن کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
2۔ مضامینِ قرآن پر مختصر نوٹ تحریر کریں؟
3۔ تلاوتِ قرآن کے ظاہری آداب بیان کیجئے؟
4۔ ''مقدارِ تلاوت'' پر مختصر نوٹ لکھیے؟
5۔ ''رموز اوقاف'' اور ''جہر واخفا'' سے کیا مراد ہے؟
6۔ قرآن پاک سے حقیقی معنوں میں مستفیض ہونے کے لیے کن صفات کا ہونا ضروری ہے؟

”آیاتِ قرآن حکیم مع ترجمہ وتشریح“

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(1)

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ○ (البقرہ:2:163)

”اور تمھارا خدا ایک ہی خدا ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں وہ بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔“

مشکل الفاظ کے معانی: اِلٰهٌ: معبود۔ لَا: نہیں، کوئی نہیں۔ اِلَّا: سوائے۔ اَلرَّحْمٰنُ: بڑا مہربان، بے حد رحم کرنے والا۔ یہ لفظ اللّٰہ کے سوا کسی اور کے لیے نہیں آتا۔ اَلرَّحِیْمُ: بہت مہربان۔

تشریح: عقیدہ توحید اسلامی تعلیمات کی بنیاد ہے اور اس آیت میں اسی کو پیش کیا گیا ہے۔ توحید کا مطلب یہ ہے کہ معبود حقیقی صرف اللّٰہ ہے جو ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور نہ ہی کوئی اس کا ہم پلّہ اور ہم سر ہے۔ وہ خود بخود ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہی سب کا خالق اور مالک ہے اور وہی سب کا رازق ہے۔ سب اس کے محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں۔ ساری کائنات کا نظام اسی کے حکم سے چل رہا ہے۔ چاند، ستارے اور سورج سب اسی کی بخشی ہوئی روشنی سے چمکتے ہیں اور اسی کے حکم سے گردش کرتے ہیں۔ ساری مخلوق کی زندگی اسی کے امر سے قائم ہے۔

عقیدہ توحید، انسان کے فکر و عمل میں ایک انقلاب برپا کر دیتا ہے۔ خدائے واحد کو رب العالمین ماننے سے عالمگیر برادری کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ تنگ نظری کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا خاکہ یکسر بدل جاتا ہے۔ انسان میں خودداری اور عزت نفس پیدا ہوتی ہے اور وہ اللّٰہ کے سوا سب سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اللّٰہ کو احکم الحاکمین ماننے سے غلامی کی تمام بندشیں کٹ جاتی ہیں اور اللّٰہ تعالیٰ کو علیم و خبیر تسلیم کر لینے کے بعد انسان چھپ کر گناہ کرنے سے بھی باز آ جاتا ہے۔

اہلِ عرب نزولِ قرآن کے وقت بت پرست تھے۔ اپنی آرزوؤں کے حصول کی خاطر اپنے بتوں کے سامنے جھکتے اور گڑگڑاتے تھے۔ اسلام نے انھیں یہ بتایا کہ تمھارا یہ عمل سراسر غلط ہے۔ یہ بت نہ تو تم کو فائدہ پہنچانے پر قادر ہیں اور نہ وہ تم کو کسی قسم کا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ تمھاری دُعاؤں کو سننے اور قبول کرنے والا صرف اللّٰہ ہے جو یکتا ہے اور اپنے بندوں پر بے حد مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ اس لیے تم صرف اسی کی عبادت کرو اور اسی کے آگے سر جھکاؤ تا کہ دین و دُنیا کی نعمتوں سے مالا مال ہو جاؤ۔

(2)

1. هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ○

”وہی اللّٰہ ہے جس کے سوا کوئی اور عبادت کے لائق نہیں (وہ) جاننے والا ہے پوشیدہ چیزوں کا اور ظاہر چیزوں کا۔ وہ بڑا مہربان انتہائی رحم والا ہے۔“

2. هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ۝

''وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اور عبادت کے لائق نہیں۔(وہ) حاکم ہے نہایت پاک ہے' سب عیبوں سے صاف ہے' امن دینے والا ہے' نگہبان ہے' غالب ہے' خودمختار ہے، بڑی عظمت والا ہے۔اللہ اس شرک سے پاک ہے جو لوگ کر رہے ہیں۔''

3. هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝ (الحشر:59:22-24)

''وہ اللہ ہے پیدا کرنے والا' بنانے والا' صورت عطا کرنے والا۔ اس کے نہایت اچھے نام ہیں' ہر چیز خواہ آسمانوں میں ہے یا زمین میں اس کی حمد وثنا کرتی ہے اور وہی غالب ہے حکمت والا۔''

مشکل الفاظ کے معانی: اَلْغَیْبُ: پوشیدہ' باطن۔اَلشَّهَادَةُ: ظاہر۔اَلْقُدُّوْسُ: پاک ذات' نہایت پاک (اسم مبالغہ)' اَلسَّلٰمُ: سب عیبوں سے صاف۔اَلْمُؤْمِنُ: امن وامان دینے والا۔اَلْمُهَیْمِنُ: محافظ ونگہبان۔اَلْعَزِیْزُ: غالب' زبردست۔اَلْجَبَّارُ: خودمختار۔اَلْمُتَکَبِّرُ: صاحبِ عظمت' سب بڑائیوں کا مالک۔اَلْخَالِقُ: پیدا کرنے والا۔اَلْبَارِئُ: بنانے والا،اَلْمُصَوِّرُ: صورتیں عطا کرنے والا،اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی: اچھے اچھے نام۔قرآن وحدیث میں اللہ تعالیٰ کے بہت سے نام بتائے گئے ہیں۔وہ سارے کے سارے بہت اچھے ہیں۔ یُسَبِّحُ: تسبیح کرتی ہے' حمد وثنا کرتی ہے۔اَلْحَکِیْمُ: دانائی والا' حکمت والا۔

تشریح: ان آیات میں صفات باری تعالیٰ کا ذکر ہوا ہے۔عربی میں اللہ خداوند تعالیٰ کے اسمِ ذات کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔اس کے سوا جو نام خدا کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں وہ سب صفاتی ہیں اور وہ اس کی کسی نہ کسی صفت اور خوبی کو ظاہر کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی خدائی صفات کا مالک نہیں۔وہی ایک پوشیدہ اور ظاہر سب کچھ جانتا ہے۔ماضی میں جو کچھ گزر چکا ہے حال میں جو کچھ موجود ہے اور مستقبل میں جو کچھ ہونے والا ہے سب کچھ بغیر کسی ذریعے کے براہ راست اس کے علم میں ہے۔وہ محسوس اور غیر محسوس' موجود اور غیر موجود ہر چیز کو جانتا ہے۔وہ سراپا رحمت ہے اور اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے۔تمام جہانوں کا حقیقی حاکم وہی ہے۔ ہر چیز کا دراصل وہی مالک ہے۔ہر شے اسی کے قبضے میں ہے اور اس کی تابع اور مطیع ہے۔

اس کی ذات میں کوئی عیب نہیں اور وہ پاکیزہ ترین ہے۔وہ سراسر سلامتی ہے۔اسے کوئی آفت یا خرابی نہیں پہنچ سکتی نہ ہی اسے کبھی زوال آئے گا۔وہ اپنے بندوں کو تمام تکلیف دہ اور خوفناک چیزوں سے پناہ دیتا ہے اور انھیں امن میں رکھتا ہے۔اگر کوئی مصیبت اس کے بندوں پر آ بھی جائے تو ایسی آئی ہوئی مصیبتوں کو دور بھی وہی کرتا ہے اور اپنے بندوں کا محافظ اور نگہبان ہے۔وہ غالب ہے اس کے مقابلے میں کوئی سر نہیں اٹھا سکتا۔اس کے سامنے سب بے بس اور لاچار ہیں۔وہ اتنا غالب ہے کہ طاقت کے ذریعے حالات کو درست کر دیتا ہے۔ کائنات کے نظام کو جس طرح چاہتا ہے چلاتا ہے اور کسی میں مجال نہیں کہ اس کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر سکے۔جتنی بھی عظمتیں ہیں وہ ساری کی ساری اسی کے لیے ہیں اور وہ بڑی سے بڑی عظمت اور کبریائی کا مالک ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اقتدار' اختیارات اور اس کی ذات وصفات میں جو لوگ بھی اس کے ساتھ کسی کو شریک کرتے ہیں وہ بہت بڑے ظالم ہیں۔اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ کسی بات میں کوئی اس کا شریک ہو۔

اللّٰہ تعالیٰ تمام کائنات کا خالق ہے۔ ہر چیز خواہ وہ مادی ہو یا غیر مادی اس کا پیدا کرنے والا اور بنانے والا صرف وہی ہے اور ہر مخلوق کو طرح طرح کی صورتیں عطا کرنے والی اسی کی ذات ہے۔ اس کے نہایت اچھے نام ہیں۔ کائنات کی ہر شے اس کی حمد و ثنا کرتی ہے۔ وہ غالب ہے اور حکمت والا ہے۔

(3)

قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ ز وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط بِیَدِکَ الْخَیْرُ ط اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (آل عمران:26:3)

''کہو اے اللّٰہ، مالک ملک کے تو ملک دیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک چھین لیتا ہے۔ تو عزت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور ذلت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ سب خیر تیرے ہاتھ میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔''

مشکل الفاظ کے معانی: تُؤْتِیْ: تو دیتا ہے۔ تَنْزِعُ: تو نکال لیتا ہے، تو چھین لیتا ہے۔ تُعِزُّ: تو عزت دیتا ہے۔ تُذِلُّ: تو ذلت دیتا ہے۔ تَشَآءُ: تو چاہتا ہے۔

تشریح: اس آیت میں ربّ تعالیٰ کی شان اور عظمت کا ذکر ہے اور یہ بات ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ ملک، حکومت اور سلطنت کا اصلی مالک اللّٰہ تعالیٰ ہی ہے۔ کائنات کی ہر شے کا خواہ وہ آسمانوں میں ہو یا زمین میں اللّٰہ ہی بلا شرکت غیرے مالک ہے۔ اسی کے اختیار میں ہے جس کو چاہے ملک و سلطنت سے نواز دے اور جس سے چاہے ملک و سلطنت چھین لے اور اس کی جگہ کسی دوسرے شخص کو کاروبارِ حکومت سونپ دے۔

عزت اور ذلت دینے والا بھی اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کے سوا نہ کوئی عزت دے سکتا ہے اور نہ ہی ذلیل کر سکتا ہے۔ جو لوگ حصولِ اقتدار یا طلبِ عزّ وجاہ میں اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے جھکتے ہیں وہ لوگ فی الحقیقت بہت احمق ہیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اقتدار کا دینا یا چھین لینا اسی طرح عزت دینا یا ذلیل و خوار کر دینا صرف اللّٰہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ہر قسم کی بھلائی اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ دُنیا کی کوئی طاقت اس کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی۔

(4)

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ط رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ o

''اور جب ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام خانہ کعبہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے (اور یہ کہہ رہے تھے) اے ہمارے پروردگار ہماری طرف سے اس کو قبول فرما بے شک تو خوب سننے والا ہے جاننے والا ہے۔''

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ ص وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا ج اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ o

''اے ہمارے ربّ، ہم دونوں کو ہمیشہ اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک جماعت پیدا فرما جو تیری فرمانبردار ہو اور ہمیں ہماری عبادت کے طریقے بتا اور ہم پر اپنی رحمت کے ساتھ رجوع فرما، بے شک تو اپنے بندوں کی طرف بہت رجوع فرمانے والا ہے، انتہائی مہربان ہے

رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلاً مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِکَ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَةَ وَيُزَکِّيۡهِمۡ ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَکِيۡمُ۝ؑ (البقرہ:2:127-129)

اے ہمارے ربّ! اور ان میں ایک رسول بھیج انھی میں سے، جو ان کے سامنے تیری آیتیں تلاوت فرمائے اور انھیں کتاب اور دانائی کی تعلیم دے اور انھیں پاک کردے، بے شک تو ہی غالب ہے حکمت والا ہے۔''

مشکل الفاظ کے معانی: اِذۡ: جب۔ اَلۡقَوَاعِدُ: نیویں، بنیادیں (واحد قاعدہ)۔ اَلۡبَيۡتِ: گھر، خانہ کعبہ۔ تَقَبَّلۡ: قبول فرما۔ مُسۡلِمَيۡنِ: دو فرمانبردار (تثنیہ)، اَرِ: دکھلا۔ مَنَاسِکَ: دستور، طریقہ عبادت (واحد مَنۡسَکۡ)۔ تُبۡ: توبہ قبول فرما، رجوع فرما۔ يَتۡلُوۡا (وہ) تلاوت کرے۔ يُزَکِّيۡ: پاک کردے۔ اَلۡحِکۡمَةَ: صحیح اور پختہ علم، دانائی اور عقل کی باتیں۔

تشریح: ان آیات میں تعمیرِ کعبہ کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی دعاؤں کا ذکر ہے۔ حضرت ابراہیم اللہ کے اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں اور اپنے بعد کے تمام نبیوں اور رسولوں کے جدامجد ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام آپؑ کے بیٹے ہیں۔ حضرت اسماعیلؑ آپؑ کے وہ فرزند ہیں جنھیں بچپن میں آپؑ نے سرزمین مکہ مکرمہ میں آکر بسایا اور جب جوان ہوئے تو تعمیر خانہ کعبہ میں شریک کیا۔

ان آیات میں بتلایا گیا ہے کہ وہ وقت یاد کیجئے جب حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام خانہ کعبہ کی بنیادیں کھڑی کررہے تھے اور تعمیر میں مشغول تھے تو ساتھ ساتھ یہ دعا کررہے تھے کہ خداوندا ہماری اس خدمت کو قبول فرما، تو ہی ہماری دعاؤں کا سننے والا ہے اور ہماری نیتوں اور ارادوں سے واقف ہے۔ اے ہمارے پروردگار! ہم تیری فرمانبرداری کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ ہمیں صحیح معنوں میں اپنا فرمانبردار بنا۔ جب تک ہم زندہ رہیں تیرے مطیع رہیں اور تیرے حکم سے سرتابی نہ کریں۔ اے ہمارے ربّ! اس اطاعت اور فرمانبرداری کا سلسلہ ہم پر ختم نہ ہوجائے بلکہ ہماری اولاد میں سے ایک جماعت ایسی پیدا کر جو تیری تابع فرمان ہو اور تیرے حکم کے سامنے اپنی گردن جھکایا کرے۔

خداوند! ہمیں اس مقدس گھر کے حج اور زیارت کے آداب بھی سکھلا دے اور ہماری طرف توجہ فرما۔ تیرے سوا کون ہے جو ہماری طرف توجہ کرے گا اور ہمارے حال پر رحم کھائے گا۔ حقیقت میں اپنے بندوں کی طرف تو ہی توجہ کرنے والا ہے اور خطا کاروں کی توبہ بار بار قبول کرنے والا ہے اور انتہائی مہربان ہے۔

اے پروردگار! ہماری نسل میں ایک ایسا اولوالعزم رسول مبعوث فرمانا جو ان میں سے ہو اور جو ان کے سامنے تیری آیات پڑھ کر سنائے اور انھیں تیری کتاب کی تعلیم دے۔ اور اس کے معانی و مطالب بھی انھیں سمجھائے جو سراسر حکمت اور عقل و دانش کی باتیں ہیں اور انھیں ہر قسم کی خامیوں اور کمزوریوں سے پاک کردے اور اخلاقِ حسنہ سے انھیں آراستہ کردے۔ خداوندا، تو ہر چیز پر غالب ہے۔ تو جو چاہتا ہے کرتا ہے تیرے کاموں میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ تو لامحدود اور بے انتہا اختیار کا مالک ہے۔ تیرا ہر کام حکمت پر مبنی ہے اور کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ مل کر تعمیر خانہ کعبہ کے وقت جتنی چیزوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں کیں وہ سب کی سب قبول ہوئیں۔

اوّل: اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ ان کی یہ خدمت قبول فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول کرلی اور خانہ کعبہ آج بھی آباد ہے اور جو

عظمت اسے ملی ہے وہ کسی اور عبادت خانے کو نہیں مل سکی۔ کروڑوں مسلمان اس کی طرف رخ کر کے نمازیں ادا کرتے ہیں اور لاکھوں افراد ہر سال فریضہ حج کی ادائیگی کی غرض سے یہاں حاضر ہوتے ہیں اور ہزاروں انسان ہر روز عمرہ ادا کرتے ہیں۔

دوسری دُعا یہ تھی کہ ہمیں اپنا فرمانبردار رکھ۔ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے بہترین بندے قرار پائے اور آسمانی کتابوں میں دونوں کی اطاعت اور فرمانبرداری کے واقعات بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے اس بات کی تصدیق کردی۔ حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ اور حضرت اسماعیلؑ ذبیح اللہ کے لقب سے نوازے گئے۔

تیسری دُعا یہ تھی کہ ہماری نسل میں ایک مسلم قوم پیدا کر۔ حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے مسلم قوم اسی نام کے ساتھ پیدا ہوئی جو قیامت تک رشد و ہدایت کا سرچشمہ بنی رہے گی۔

چوتھی چیز جس کی خواہش دونوں نے کی وہ یہ تھی کہ ہمیں حج کے طریقے سکھا دے۔ یہ دُعا بھی قبول ہوئی اور آپؑ کو حج کے تمام طریقے سکھائے گئے اور امت مسلمہ ہر سال تمام مناسک و آداب کے ساتھ فریضہ حج ادا کرتی ہے۔ یہ وہی آداب ہیں جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کو سکھائے گئے۔ مشرکینِ مکہ نے ان میں کچھ باتیں غلط قسم کی اپنی طرف سے شامل کر رکھی تھیں مگر حضور اکرم ﷺ نے غلط باتوں کو مٹا کر صحیح مناسکِ حج کو از سرِ نو زندہ کیا جن پر اُمتِ مسلمہ عمل پیرا ہے اور تا قیامت ان پر عمل ہوتا رہے گا۔

پانچویں خواہش یہ تھی کہ ہماری اولاد میں ایک ایسا رسول مبعوث فرما جو ان چند صفات سے متصف ہو۔ اول یہ کہ اس پر کتاب نازل ہو اور وہ اس کی آیات لوگوں کو پڑھ کر سنائے۔ دوم یہ کہ وہ نہ صرف سنائے بلکہ جہاں جہاں کتاب اللہ کے سمجھنے میں لوگوں کو دشواری پیش آئے تو اس کی تشریح و توضیح قول و عمل سے کر کے ان کے ذہن نشین کرا دے یعنی انھیں کتاب کی تعلیم دے۔ سوم یہ کہ وہ لوگوں کو حکمت و دانائی کی باتیں سکھائے۔ چہارم یہ کہ وہ لوگوں کے نفوس کو پاک کر دے۔ انھیں شرک و کفر اور ظلم و معصیت سے متنفر کر دے اور ہر قسم کی خامیوں اور کمزوریوں سے پاک کر کے انھیں اخلاقِ حسنہ سے آراستہ کر دے۔ یہ خواہش بھی رَبّ تعالیٰ نے پوری فرمائی اور ان تمام صفات سے متصف رسول حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے اسی مقام پر پیدا ہوا جہاں یہ دُعا کی گئی تھی۔ تمام پیغمبر جو حضرت ابراہیمؑ کے بعد تشریف لائے آپؑ کے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ صرف آنحضور ﷺ حضرت اسماعیلؑ کی نسل میں سے ہوئے اور دعائے ابراہیم مکمل طور پر قبول ہوئی۔ آپ ﷺ کو نہ صرف رسول بنا کر بھیجا گیا بلکہ خاتم النّبیّین بنا کر مبعوث فرمایا گیا۔ آپ ﷺ کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ آپ ﷺ کے بعد نہ کوئی نبی آیا اور نہ آئے گا۔

(5)

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○

(آل عمران: 164:3)

”بے شک اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر احسان فرمایا کہ ان میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا۔ جو ان کے سامنے اللہ کی آیتیں پڑھتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اگر چہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔“

مشکل الفاظ کے معانی: مَنَّ: احسان کیا۔ بَعَثَ: بھیجا۔ مِنْ اَنْفُسِهِمْ: ان ہی میں سے۔ ضَلَالٌ: گمراہی، مُبِيْنٌ: کھلی ہوئی، واضح۔

تشریح: اس آیت میں نبی کریم ﷺ کے وہ اوصاف بیان ہوئے ہیں جو دُعائے ابراہیمی میں مذکور ہیں۔ یہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی دُعا کی قبولیت کا ایک واضح ثبوت ہے کہ جن صفات کے ساتھ متصف رسول بھیجنے کی باپ بیٹے نے دُعا کی تھی انھی اوصاف والا رسول ان کی اولاد میں سے ربّ تعالیٰ نے بھیجا۔ رسول اکرم ﷺ کی تشریف آوری اللّٰہ کا وہ عظیم احسان ہے جس کا شکر ادا نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے تو آپ ﷺ کا وجود تمام کائنات کے لیے نعمت ہے مگر اہلِ ایمان کے لیے یہ نعمت اللّٰہ کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہے کیونکہ آپ ﷺ پر ایمان لا کر ہی وہ دین و دُنیا میں سرخرو ہوئے۔ اس لیے خداوند عالم نے اہلِ ایمان پر اس نعمت کا احسان جتلایا اور فرمایا کہ اللّٰہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ انھی میں سے ان میں اپنا رسول بھیجا جس کی صفات یہ ہیں۔

1۔ تلاوت آیات:

یعنی قرآن کریم کی آیات کو جو اللّٰہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں لوگوں کو پڑھ کر سناتے ہیں۔ آیاتِ قرآنی اپنے اندر اعجاز رکھتی ہیں کہ دُنیا کے تمام جن و انس مل کر بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے مگر جب رسول عربی ﷺ ان کی تلاوت کرتے ہیں اور لوگوں کو پڑھ کر سناتے ہیں تو پتھر دل موم ہو جاتے ہیں۔ یوں تلاوتِ آیات کریمہ آپ ﷺ کے خصوصی اوصاف میں سے ہے۔

2۔ تزکیہ نفوس:

صدیوں سے گمراہ اور بدکردار لوگوں کے دلوں کو گندگیوں سے پاک کرتے ہیں۔ بت پرستی اور گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے لوگوں کے دل سیاہ ہو گئے تھے۔ رسول کریم ﷺ ان کے دلوں کو صاف اور پاک کر دیتے ہیں۔ بگڑی ہوئی انسانیت کو حیوانیت سے نکال کر اخلاقِ عالیہ سے آراستہ کرنا رسول عربی ﷺ ہی کا کام ہے۔ عرب جیسی غیر مہذب قوم کو تہذیب کی بلندیوں پر پہنچا دینا تزکیہ نفوس نہیں تو اور کیا ہے۔

3۔ تعلیمِ کتاب:

یعنی کتاب اللّٰہ کی تشریح و توضیح کرتے ہیں اور اس کے اسرار و رموز اور معانی و مطالب بتاتے ہیں اور اس کے مشکل مقامات کی وضاحت کرتے ہیں۔

4۔ تعلیمِ حکمت:

یعنی عقل و دانش کی باتیں سکھاتے ہیں اور اپنے اقوال و اعمال کے ذریعے ان تمام مسائل کا حل بتا دیتے ہیں جنھیں فلسفی اور اہلِ عقل حل کرنے سے قاصر رہے ہیں۔

رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم دُنیا کی گمراہ ترین قوم میں بھیجے گئے۔ آپ ﷺ کی بعثت کے وقت ساری دُنیا پستی کا شکار تھی۔ ہر قوم کی اخلاقی، مذہبی، سیاسی اور سماجی حالت بہت ابتر تھی۔ عربوں کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ تھی۔ پورے جزیرہ عرب پر قبائلی نظام چھایا ہوا تھا۔ قبیلے کے باہر محبت اور اخوت کا نام و نشان تک نہ تھا۔ لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ معمولی سی بات پر تلواریں بے نیام ہو جاتی تھیں۔ جنگ ایک دفعہ چھڑ جاتی تو تیس تیس چالیس چالیس سال تک ختم ہونے کا نام نہ لیتی۔ سخاوت کی آڑ میں جوا اور شراب خوری پروان

چڑھ رہی تھی۔ بہادری کے نام پر ظلم وتشدد کا دور دورہ تھا۔ جھوٹے وقار کی خاطر معصوم بچیاں زندہ درگور کی جا رہی تھیں۔ بت پرستی اور شرک کا یہ حال تھا کہ خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت رکھے تھے جن کی پرستش کی جاتی تھی۔ اہلِ عرب کی اسی گمراہی کو قرآن حکیم نے ضَلَالٍ مُّبِيۡنٍ کا نام دیا ہے۔ یہ رسول کریم ﷺ کی رسالت کی برکت ہے کہ دُنیا کی جاہل ترین قوم سارے عالم کی ہادی اور رہنما بن گئی۔ حضور ﷺ کی بعثت اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے چونکہ اس نعمت سے صرف مسلمان ہی پورے طور پر بہرہ ور ہوئے ہیں یا ہو سکتے ہیں اس لیے یہ احسان اللہ نے فی الحقیقت مسلمانوں کے ساتھ ہی کیا ہے۔

(6)

لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِيۡصٌ عَلَيۡكُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌo

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُلۡ حَسۡبِىَ اللّٰهُ قزصلے لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ طعَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَ هُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِيۡمِoع

(التوبہ 9:128-129)

''بے شک تمھارے پاس ایک ایسے رسول تشریف لائے ہیں جو تم میں سے ہیں جن پر تمھارا مشقت میں پڑنا سخت گراں گزرتا ہے جو تمھاری بھلائی کے نہایت چاہنے والے ہیں جو ایمانداروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق ہیں انتہائی مہربان ہیں' پھر اگر وہ منہ پھیریں تو کہہ دیجئے کہ مجھے اللہ کافی ہے۔ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں میں نے اسی پر بھروسہ کیا۔ اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے۔''

مشکل الفاظ کے معانی: عَزِيۡزٌ: گراں' تکلیف دہ۔ عَنِتُّمۡ: تم مشقت میں پڑ گئے۔ حَرِيۡصٌ: خیر خواہ۔ رَءُوۡفٌ: بہت شفیق' مہربان۔ تَوَلَّوۡا: وہ منہ پھیر لیں' روگردانی کر لیں۔ حَسۡبِىَ: میرے لیے کافی ہے۔ مجھے کافی ہے۔ تَوَكَّلۡتُ: میں نے بھروسہ کیا۔

تشریح: پہلی آیت میں رسول کریم ﷺ کی چار صفات بیان ہوئی ہیں۔

1. مِنۡ اَنۡفُسِكُمۡ:

تم میں سے ہیں۔ نوعِ انسانی سے تعلق رکھتے ہیں اور تمھارے ہم قوم ہیں۔ اجنبی نہیں ہیں تم ان سے اچھی طرح واقف ہو۔ بچپن ہی سے ان کے اخلاق و کردار کو تم دیکھتے رہے ہو اور تم ہی ان کو صادق اور امین کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ ان کی سچائی اور راست بازی پر تم گواہ تھے۔ اب وہ یہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تمھاری طرف ہدایت کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے تو تم ان کے اس قول کو سچا کیوں نہیں سمجھتے اور جھوٹ کا الزام کیوں لگاتے ہو؟

2. عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ:

جو بات تمھیں مشقت میں ڈالے یا جس چیز سے تمھیں تکلیف پہنچے وہ ان پر بہت گراں گزرتی ہے۔ وہ ہر ممکن طریقے سے تمھاری پریشانیوں کو دُور کرتے ہیں اور جو دین لے کر آئے ہیں وہ بہت آسان ہے۔ اس پر عمل کرنے میں کوئی تکلیف نہیں۔ تمھاری وہ غلط کاریاں جو عذابِ الٰہی کو دعوت دے رہی ہیں ان کے لیے سخت پریشان کن ہیں۔

3. حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ:

تمھاری خیرخواہی اور نفع رسانی کی خاص تڑپ ان کے دل میں پائی جاتی ہے جس طرح باپ اپنی اولاد کی بھلائی کے لیے حریص ہوتا ہے۔اسی طرح رسول کریم ﷺ تمام انسانوں کی بھلائی کے خواہاں ہیں۔

4. بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُ وْفٌ رَّحِيْمٌ:

آپ ﷺ رحمتہ للعالمین بن کر تشریف لائے ہیں اور آپ ﷺ تمام مخلوقات کے لیے رحمت ہیں لیکن ایمان والوں کے ساتھ آپ ﷺ کی شفقت ورافت کی انتہا نہیں۔ جو لوگ آپ ﷺ کے دین کو قبول کرتے ہیں ان پر آپ ﷺ کے کرم کی بارش برستی ہے اور ان کے ساتھ بے حد شفقت سے پیش آتے ہیں۔

دوسری آیت میں ربّ تعالیٰ نے آنخضور ﷺ کو فرمایا کہ اگر لوگ آپ ﷺ کی بات نہ مانیں اور روگردانی کریں تو کہہ دیجئے کہ مجھے میرا اللہ کافی ہے۔ اسی پر میرا بھروسہ ہے اور وہ عرشِ عظیم کا مالک ہے۔ میں تمھیں ایمان کی دعوت اس لیے دے رہا ہوں کہ اس میں تمھاری بھلائی ہے اگر تم اسے قبول نہ کرو گے تو میرا کچھ نہیں بگڑتا۔ میرے لیے میرا اللہ کافی ہے جس کی قدرت کا اندازہ ہی نہیں لگایا جاسکتا۔

(7)

هُوَالَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًاؕ

”(اللہ) وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا تا کہ اسے سب ادیان پر غالب کر دے اور اس بات کا اللہ بطور گواہ کافی ہے۔“

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا٘ سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِکَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰةِ ۚۖ وَمَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ ۚ قف کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْکُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا

(الفتح:48:28-29)

”محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں، وہ کافروں کے مقابلے میں سخت ہیں اور آپس میں نرم دل ہیں۔ تو انھیں دیکھے گا رکوع کرتے ہوئے سجدہ کرتے ہوئے اور اللہ کا فضل اور رضا چاہتے ہوئے، ان کی نشانی سجدوں کی تاثیر سے ان کے چہروں پر موجود ہے۔ یہ ان کی صفت تورات میں ہے اور انجیل میں ان کی صفت ہے جیسے ایک کھیتی۔ کہ اس نے اپنی سوئی نکالی پھر اسے طاقت دی پھر خوب موٹی ہوگئی۔“

”پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہوگئی کہ کسانوں کو بھلی لگتی ہے، اللہ نے مسلمانوں کو ترقی اس لیے دی کہ ان کے ذریعے کافروں کے دل جلائے اللہ نے ان کے لیے جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے، بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے۔“

مشکل الفاظ کے معانی: اَرْسَلَ: بھیجا۔ھُدٰی: ہدایت، مراد قرآن حکیم۔دِیْنِ الْحَقِّ: سچا دین یعنی اسلام۔لِیُظْھِرَہٗ: تاکہ اسے غالب کردے۔وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ: اور وہ جو رسول کریم ﷺ کے ساتھ ہیں یعنی اہلِ بیت اور صحابہ کرامؓ۔اَشِدَّآءُ: سخت، قوی، غالب (واحد شَدِیْدٌ)۔ رُحَمَآءُ: نرم دل، مہربان (واحد رَحِیْمٌ)۔رُکَّعاً: جھکنے والے، رکوع کرنے والے (واحد رَاکِعٌ)۔سُجَّدًا: سجدہ کرنے والے (واحد سَاجِدٌ) یَبْتَغُوْنَ: وہ چاہتے ہیں، تلاش کرتے ہیں۔رِضْوَان: خوشنودی، رضامندی، قرب۔سِیْمَا: علامت، نشانی۔زَرْعٌ: کھیتی۔شَطْءٌ: سوئی، کونپل، پتی۔اٰزَرَ: طاقت دی، مضبوط کیا۔اِسْتَغْلَظَ: موٹا ہوگیا۔اِسْتَوٰی: سیدھا کھڑا ہوگیا، کمال کو پہنچا۔سُوْق: تنا، جڑیں (واحد سَاقٌ) یُعْجِبُ: تعجب میں ڈالتا ہے، خوش کرتا ہے۔زُرَّاع: کسان، کھیتی باڑی کرنے والے۔(واحد زَارِعٌ) لِیَغِیْظَ: تاکہ دل جلائے، غیظ میں لائے، غصہ دلائے۔

تشریح: ان آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللّٰہ ﷺ ہدایت اور سچا دین لے کر تشریف لائے ہیں۔آپ اللّٰہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نبی ہیں جو اعلیٰ اخلاق اور بلند کردار کا پیکر ہیں۔اللّٰہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو دو عطیات بھی دیئے ہیں۔ہدیٰ اور دین الحق یعنی قرآن حکیم جو سراسر رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہے اور اسلام جو سچا دین اور برحق ہے۔قرآن مجید کا نور دُنیا کے کونے کونے میں پھیل جائے گا اور دین اسلام کا دُنیا میں بول بالا ہوگا۔یہی اللّٰہ کی مرضی اور اس کی مشیت ہے کہ یہ دین نہ صرف عرب کے دینوں پر غالب آجائے بلکہ دُنیا کے تمام مذاہب پر چھا جائے گا۔کفار چاہے اس کی کتنی مخالفت کیوں نہ کریں اور اس دین کو مٹانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور ہی کیوں نہ لگا دیں۔اللّٰہ تعالیٰ کی مرضی پوری ہو کر رہے گی۔اس غلبہ اسلام پر اللّٰہ تعالیٰ گواہ ہے اور اس کی ضمانت دیتا ہے یا یہ کہ اللّٰہ تعالیٰ حضور ﷺ کی رسالت کے برحق ہونے پر گواہ ہے۔اللّٰہ تعالیٰ سے بڑھ کر اور کون گواہ ہو سکتا ہے۔اللّٰہ کی گواہی کے بعد کسی اور کی گواہی کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

دین اسلام کے غلبہ اور برتری کا واضح ثبوت یہ ہے کہ اس دین کو جو پیغمبر لے کر آیا ہے وہ محمد ﷺ ہیں جو اللّٰہ کے برگزیدہ رسول ہیں اور آپ ﷺ کے ساتھی بھی مکمل طور پر تربیت یافتہ ہیں۔وہ نہایت منظم ہیں اور باہمی محبت و خلوص کا پیکر ہیں۔جذبہ اخوت و ہمدردی سے سرشار ہیں لیکن کفار کے مقابلے میں نہایت قوی اور ناقابلِ تسخیر ہیں۔ان سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔ان کے مقابلے میں نہایت پامردی کے ساتھ ڈٹ جاتے ہیں۔انھیں اپنی قوت ہی پر بھروسہ نہیں، وہ نصرتِ الٰہی کے بھی خواہاں ہیں۔وہ اس امر سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اللّٰہ کی مدد کے بغیر معمولی سے معمولی کام بھی نہیں بن سکتا۔نہایت کثرت سے نمازیں پڑھتے ہیں جب دیکھو رکوع میں جھکے ہوئے ہیں یا سجدے میں پڑے ہوئے ہیں۔

مومنین کی یہ صفات توریت میں بھی بیان ہوئی ہیں۔انجیل میں ان کی مثال ایک کھیتی سے دی گئی ہے جس طرح کھیتی کونپل نکالتی ہے اور رفتہ رفتہ مضبوط ہوتی جاتی ہے۔پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہو جاتی ہے۔اسی طرح مسلمان ابھی کمزور ہیں اور ان کی تعداد بھی زیادہ نہیں ہے۔رفتہ رفتہ ان کی قوت و طاقت میں اضافہ ہوگا اور ان کی تعداد بھی بڑھے گی اور اسلام روز بروز ترقی کرتے ہوئے اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے گا۔اسلام کی تدریجی ترقی کو دُنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔جس طرح کسان اپنی کھیتی کو لہلہاتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتا ہے اللّٰہ کا رسول اور اس کے ساتھی بھی اسلام کی دن دونی رات چوگنی ترقی کو دیکھ کر خوش ہوں گے اور کفار کے اسلام کو ختم کرنے کے سارے منصوبے خاک میں مل جائیں گے اور وہ مسلمانوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں جلیں گے لیکن ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکیں گے۔

اللّٰہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ایمان والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو مغفرت عطا کرے گا اور بہت بڑا اجر دے گا۔

حضور ﷺ کے ساتھیوں کے چند اوصاف اس آیت میں مذکور ہوئے ہیں۔

1. اَشِدَّ آءُ عَلَى الْكُفَّارِ:

یعنی باطل کی قوت کے مقابلے پرڈٹ جانے والے ہیں۔نتیجہ سے بے نیاز ہوکر اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے نکل پڑتے ہیں۔

2. رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ:

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ بڑی مروّت اور ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔

یہی دو صفات ہیں جن سے قومیں عروج حاصل کرتی ہیں۔اول مخالف قوتوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت دوم باہمی اتفاق واتحاد جو باہمی رواداری اور محبت سے پیدا ہوتا ہے۔ایسے افراد جو اپنوں کے لیے تو شیر ہوتے ہیں اور غیروں کے آگے بھیگی بلّی بنے ہوتے ہیں۔بہت جلد حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ جاتے ہیں۔

3. تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا:

جب ان کو دیکھو یا تو رکوع میں ہوتے ہیں یا سجدے میں یعنی بہ کثرت نمازیں پڑھتے ہیں۔یادِالٰہی سے کسی وقت بھی غافل نہیں رہتے۔

قرآن مجید میں ایک اور جگہ فرمایا ہے:۔

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (آل عمران: 191:3)

”وہ لوگ جو اللہ کی یاد میں مصروف رہتے ہیں کھڑے بھی اور بیٹھ کر بھی اور لیٹ کر بھی۔“

4. يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا:

ان کو اگر کسی شے کی تلاش ہے تو صرف اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی۔ہر ایک کام میں اللہ کی خوشنودی کے خواہاں اور ہر عمل میں اللہ کے فضل کے طلب گار ہیں۔

5. سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ:

ان کے چہرے پر کثرتِ عبادت کے باعث ایک عجیب قسم کا نور اور ایک لطیف سی چمک پیدا ہو جاتی ہے جس کو دیکھ کر لوگ آسانی سے ان کو پہچان لیتے ہیں۔

آیت کے آخری حصے میں اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فرما کر یہ بتا دیا کہ ایمان اور عملِ صالح لازم وملزوم ہیں۔ایمان کے بغیر ہر عمل بے معنی ہے اور عمل کے بغیر ایمان کا کچھ اعتبار نہیں۔

(8)

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ (احزاب: 40:33)

”محمد ﷺ تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، لیکن اللہ کے رسول ہیں اور تمام نبیوں میں سے آخری ہیں۔اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔“

مشکل الفاظ کے معانی: رِجَالٌ: مرد، آدمی (واحد رَجُلٌ) خَاتَمُ النَّبِيّٖنَ: نبیوں کے سلسلے کو ختم کرنے والے۔انبیاؑ میں سے آخری۔خَاتَم کا لفظی معنی ہے وہ چیز جس سے کسی کو ختم کیا جائے۔حضور ﷺ بھی خاتم ٹھہرے کہ آپ ﷺ کی بعثت پر نبوت کا سلسلہ ختم کیا گیا۔

تشریح: رسول اللہ ﷺ اُمت میں کسی مرد کے باپ نہیں کیونکہ آپ ﷺ کی نرینہ اولاد بچپن میں ہی فوت ہوگئی یوں آپ ﷺ مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، بلکہ اللہ کے رسول ہیں اور نبوت کو ختم کرنے والے ہیں۔ آپ ﷺ کی تشریف آوری سے نبوت کا وہ سلسلہ جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا تھا ختم ہوتا ہے۔ آپ ﷺ کے بعد کوئی اور رسول یا نبی نہیں آ سکتا۔

اس آیت میں رسول کریم ﷺ کی ایک خصوصی صفت بیان ہوئی ہے وہ ہے آپ ﷺ کا خاتم النبیین ہونا۔ یہ وہ وصف ہے جو کسی اور پیغمبر کو نہیں ملا۔ اللہ نے آپ ﷺ کو ختم نبوت کا اعزاز عطا فرما کر تمام رسولوں اور نبیوں پر آپ ﷺ کی فضیلت ثابت کر دی اور آپ ﷺ کے آخری نبی ہونے پر شہادت دے دی۔

(9)

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ۙ	''اے نبی یقیناً ہم نے تمھیں گواہی دینے والا، خوشخبری سنانے والا،
وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ۝	ڈرانے والا، اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور
(احزاب:33:45-46)	روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔''

مشکل الفاظ کے معانی: شَاهِدٌ: گواہ۔ مُبَشِّرٌ: بشارت دینے والا، خوشخبری سنانے والا۔ نَذِیْرٌ: ڈرانے والا۔ انجام بد سے آگاہ کرنے والا۔ دَاعِی: دعوت دینے والا، بلانے والا۔ سِرَاجٌ: چراغ، سورج کے لیے بھی سراج کا لفظ قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے۔ مُنِیْرٌ: روشن کرنے والا، روشن۔

تشریح: ان دو آیتوں میں آنحضور ﷺ کے پانچ عظیم القاب کا بیان ہے سب سے پہلے آپ ﷺ کو شاہد کے لقب سے پکارا گیا۔

(1) شاہد کا لغوی معنی گواہی دینے والا ہے۔ مفسرین نے آپ ﷺ کے شاہد ہونے کی درج ذیل صورتیں بیان کی ہیں۔

1۔ آپ ﷺ حق و صداقت کے گواہ ہیں۔

2۔ آپ ﷺ خدا کی ذات اور صفات کے گواہ ہیں کیونکہ آپ ﷺ نے مشاہدہ حق کیا اور یوں شاہد قرار پائے۔ اسی طرح آپ ﷺ جنت و دوزخ اور عالمِ غیب سے تعلق رکھنے والی تمام مخلوق کے وجود کے بھی گواہ ہیں کیونکہ ان سب کا بھی آپ ﷺ کو مشاہدہ کرایا گیا۔

3۔ آپ ﷺ اپنی امت کے بارے میں اللہ کے ہاں قیامت کے دن گواہ ہوں گے۔

4۔ آپ ﷺ قیامت کے دن انبیا علیہم السلام کے حق میں گواہی دیں گے۔ آپ ﷺ ان سب کے تبلیغی مشن سے بذریعہ وحی باخبر ہیں۔

(ب) مُبَشِّر: یہ آپ ﷺ کا دوسرا لقب ہے جو یہاں اور قرآن کی دیگر آیات میں مذکور ہوا۔ آپ ﷺ نیک لوگوں کو اچھی جزا اور جنت کی خوش خبری سنانے والے ہیں اور ایسے ہی بدکار اور خطا کار لوگوں کو توبہ کرنے پر اللہ کی بخشش کی بشارت دینے والے ہیں۔

(ج) نَذِیْر: آپ ﷺ کو اس لقب سے بھی اکثر مقامات پر پکارا گیا۔ آپ ﷺ کے مشن میں داخل ہے کہ انسانوں کو کفر و شرک اور گناہوں کے انجام بد سے آگاہ کریں اور کفار و منافقین کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیں کیونکہ اللہ نے آپ ﷺ کو نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

(د) دَاعِیُ اِلَی اللّٰہِ: آپ ﷺ لوگوں کو اللّٰہ کی عبادت اور اطاعت کی طرف اللّٰہ کے حکم سے بلانے والے ہیں۔ ویسے تو ہر نبی اور رسول اپنی اُمت کو اللّٰہ کی طرف بلانے والا ہوتا ہے مگر آپ ﷺ کی دعوت کامل اور عالمگیر ہے اس لیے آپ ﷺ کو خصوصی طور پر داعی اِلَی اللّٰہ کا لقب ملا۔

(ہ) سِرَاجٌ مُّنِیۡر: روشن چراغ یا روشن آفتاب' جس طرح چراغ مکان کی تاریکی کو ختم کرتا ہے اس طرح آپ ﷺ نے اہلِ ایمان کے دلوں سے کفر وشرک کی تاریکی کو نکال دیا اور ان کے دل منور کر دیئے۔ یا جس طرح سورج آسمان میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اسی طرح آپ ﷺ کو انبیا علیہم السلام میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس مناسبت سے آپ ﷺ کو سراج منیر کہا گیا۔

(10)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَالۡكِتٰبِ الَّذِیۡ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوۡلِهٖ وَالۡكِتٰبِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ مِنۡ قَبۡلُ ؕ وَمَنۡ یَّكۡفُرۡ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِیۡدًا ۝ (النساء:4:136)

''اے ایمان والو! ایمان لاؤ' اللّٰہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے اُتار چکا ہے جس نے اللّٰہ کا اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور آخرت کے دن کا انکار کیا وہ بہت دور گمراہی میں جا پڑا۔''

مشکل الفاظ کے معانی: اٰمَنُوۡا: وہ ایمان لائے۔ اٰمِنُوۡا: تم ایمان لاؤ۔ نَزَّلَ: اتارا' تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا جیسا کہ قرآن کریم جو تیئیس سال کے عرصے میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا۔ اَنۡزَلَ: اُتارا' ایک ساتھ اتارا' جیسا کہ تورات اور انجیل جو ایک ہی وقت میں کتابی شکل میں نازل ہوئیں۔

تشریح: اس آیت میں ان لوگوں سے خطاب کیا گیا ہے جو لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ کہہ کر مومن ہو گئے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے والو سچے مسلمان بن جاؤ۔ سچے مسلمان بننے کے لیے ضروری ہے کہ ان چیزوں پر ایمان لاؤ۔

(۱) اللّٰہ کے موجود ہونے اور اس کے ایک ہونے پر کامل ایمان لاؤ۔ اللّٰہ کی ذات اور اس کی تمام صفات پر پختہ یقین رکھو کہ وہ اپنی ذات میں یکتا اور لاثانی ہے۔ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کا نہ کوئی باپ ہے اور نہ بیٹا۔ وہ سب کا خالق ہے اور سب کا رازق ہے اور علیم وقدیر اسی کی ذات ہے۔

(۲) اس کے رسول حضرت محمد ﷺ کے نبی برحق ہونے پر کامل ایمان لاؤ اور اس امر پر بھی کہ آپ ﷺ خاتم النبیین ہیں اب کوئی اور نبی نہیں آئے گا۔ آپ ﷺ کے بعد جو کوئی بھی نبوت کا دعویٰ کرے گا وہ جھوٹا ہے۔

(۳) اس کتاب پر بھی کامل ایمان لاؤ جو اللّٰہ نے آنحضرت ﷺ پر نازل فرمائی۔ اس کتاب یعنی قرآن حکیم پر یوں ایمان لانا ہے کہ اس کا ایک ایک حرف اللّٰہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پر نازل فرمایا ہے اور یہ کتاب بالکل برحق ہے۔ دین ودُنیا کی تمام بھلائیاں اس کتاب پر عمل کرنے سے حاصل ہو سکتی ہیں۔

(۴) ان کتابوں کے بھی برحق ہونے پر ایمان لانا ہے جو پچھلے رسولوں پر نازل ہو چکی ہیں۔ مثلاً تورات حضرت موسیٰ علیہ السّلام پر نازل

ہوئی، انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السّلام پر اُتری اور زبور حضرت داوٗد علیہ السّلام پر نازل ہوئی۔

اسلام نے ایک مسلمان کے لیے پانچ چیزوں پر ایمان لانا اور ان پر دِل و جان سے یقین کرنا ضروری قرار دیا ہے جو اجزائے ایمان کہلاتے ہیں۔ یعنی (۱) ایمان باللّٰہ (۲) ایمان بالملٰئکۃ (۳) ایمان بالکتب (۴) ایمان بالرسل (۵) ایمان بالیوم الآ خر۔ اس آیت میں ایمان بالملٰئکۃ ایمان بالرسل اور ایمان بالیوم الآ خر نہ رکھنے والوں کو کافر قرار دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ انتہائی گمراہی میں ہیں۔

یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اللّٰہ تعالیٰ کے تمام رسولوں اور نبیوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اگر ایک بھی رسول یا نبی سے منکر ہو گیا تو ایسا شخص بالکل دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا چاہے دوسری چیزوں پر اس کا عقیدہ کتنا ہی راسخ کیوں نہ ہو۔ ایسے انبیاؑ اور مرسلینؑ جن کے نام نامی قرآن مجید میں مذکور ہوئے ان پر نام بنام ایمان لانا ہے اور جن کے نام قرآن مجید میں بیان نہیں ہوئے۔ ان پر مختصراً عقیدہ رکھنا ہے کہ جتنے بھی اللّٰہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیجے سارے کے سارے سچے تھے انھوں نے بلاکم و کاست اللّٰہ تعالیٰ کا پیغام ان قوموں تک پہنچا دیا جن میں وہ مبعوث ہوئے تھے۔ اسی طرح جتنی بھی کتابیں اللّٰہ تعالیٰ نے قرآن مجید سے پہلے وقتاً فوقتاً نازل فرمائیں۔ وہ سب کی سب سچی کتابیں تھیں۔ اس زمانے میں ان پر عمل فرض تھا اب قرآن مجید کے آ جانے کے بعد ان پر عمل ختم کر دیا گیا۔ اسی طرح عقیدہ یوم الآ خر کے سلسلے میں اُن تمام تفاصیل پر ایمان لانا ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے جو قرآن حکیم یا احادیث صحیحہ میں بیان ہوئی ہیں۔ جن میں جنت و دوزخ وغیرہ سب شامل ہیں۔ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک حقیقت کا منکر ہوا تو وہ مسلمان نہیں رہتا۔

یہ آیت اسلامی عقائد کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔

(11)

إِذَاالسَّمَآءُ انفَطَرَتْ ○ۙ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ○ۙ وَإِذَ الْبِحَارُ فُجِّرَتْ○ۙ

’’جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب تارے بکھر جائیں گے اور جب سمندر اُبل پڑے گا۔

وَإِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ○ۙ

اور جب قبریں کھودی جائیں گی۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ○ؕ يٰٓاَ يُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ○ۙ الَّذِىْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ○ۙ

(اس وقت) ہر شخص جان لے گا جو کچھ اس نے آگے بھیجا اور جو اس نے پیچھے چھوڑا۔ اے انسان کس چیز نے تجھے اپنے رَبّ کریم کے بارے میں دھوکے میں ڈال رکھا ہے؟ وہ رَبّ جس نے تجھے بنایا پھر تجھے ٹھیک ٹھاک کیا پھر تجھے متناسب بنایا۔‘‘

فِىْٓ اَىِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ○ؕ

’’اور جس شکل میں تجھے چاہا جوڑ دیا‘‘

كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ○ۙ

’’(ہرگز دھوکے میں نہیں رہنا چاہیے) ہاں تم جزا اور سزا کو جھٹلاتے ہو۔

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ○ۙ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ○ۙ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ○

حالانکہ تم پر نگہبان (فرشتے) مقرر ہیں جو معزز لکھنے والے ہیں۔ وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِىْ نَعِيْمٍ○ج وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِىْ جَحِيْمٍ○ج صلے

بلاشبہ نیک لوگ جنت میں ہوں گے اور بدکار لوگ بے شک دوزخ میں ہوں گے۔

يَّصْلَوْ نَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ o	جزا کے دن وہ اس میں داخل ہوں گے۔
وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِيْنَ o ط	اور وہ اس دوزخ سے کبھی باہر نہ نکل سکیں گے۔
وَمَآ اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ o لا	تجھے کیا خبر کہ جزا کا دن کیسا ہے؟
ثُمَّ مَا اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ o ط	پھر (کہتے ہیں) تجھے کیا خبر کہ جزا کا دن کیسا ہے؟ وہ دن ایسا ہے
يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ط وَالْاَ مْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ o	کہ کوئی شخص کسی کے لیے کچھ نہ کر سکے گا اور سارا حکم اس دن اللّٰہ
(الانفطار: 82:1-19)	ہی کا ہوگا۔"

مشکل الفاظ کے معانی: اِنْفَطَرَتْ: پھٹی۔ اِذَا: جب فعل ماضی پر داخل ہوتو اسے مستقبل کے معنی میں بدل دیتا ہے اس لیے اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ کا معنی ہوگا۔ جب آسمان پھٹ جائے گا۔ كَوَاكِبُ: ستارے (واحد كَوْكَبٌ) اِنْتَثَرَتْ: بکھر جائیں گے۔ فُجِّرَتْ: بہا دیئے جائیں گے (ماضی بمعنی مستقبل بوجہ اِذَا) بُعْثِرَتْ۔ کھودی جائیں گی۔ اکھاڑی جائیں گی۔ قَدَّمَتْ: آگے بھیجا یعنی صدقات واعمال۔ اَخَّرَتْ: پیچھے چھوڑا (مال وراثت وغیرہ) یا وہ کام جو بے کیے چھوڑ دیئے۔ یا وہ کام جن کی بنیاد رکھ گیا۔ سَوّٰی: درست کیا۔ عَدَلَ: سنوارا' مناسبت کے ساتھ بنایا۔ رَكَّبَ: اکٹھا کیا' ایک شکل دینے کے لیے جوڑ دیا۔ دِيْنٌ: حساب' جزا وسزا' مراد قیامت۔ كِرَامٌ: معزز' جلیل القدر (واحد كَرِيْمٌ) كَاتِبِيْنَ: لکھنے والے (واحد كَاتِبٌ) نَعِيْمٌ: آرام' آسائش' خوشی۔ فُجَّارٌ: بدکار لوگ' بے راہ رو (واحد فاجِرٌ) جَحِيْمٌ: تیز دہکتی ہوئی آگ۔ جہنم' يَصْلَوْنَ: آگ میں داخل ہوں گے' جلیں گے۔ غَائِبِيْنَ: غیر حاضر' جدا' الگ (واحد غَائِبٌ)۔

تشریح: اس سورت میں قیامت کے چند اہم واقعات بیان ہوئے ہیں اور انسان کو اخروی زندگی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

رَبّ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق قیامت کا آنا ضروری ہے۔ وہ ایک زبردست انقلاب کا نام ہے جس میں کائنات کا سارا نظام مقررہ وقت پر درہم برہم ہو جائے گا۔ آسمان پھٹ جائے گا اور نظام فلکی تہس نہس ہو جائے گا۔ ستارے بکھر کر تباہ ہو جائیں گے۔ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اُڑتے پھریں گے۔ سمندر بہہ نکلیں گے اور ان کا پانی پھیل جائے گا۔

قرآن کریم کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت حضرت اسرافیلؑ کے صور پھونکنے پر برپا ہوگی۔ اس سورت کی پہلی تین آیات میں قیامت کا پہلا مرحلہ بیان ہوا ہے جس میں کائنات کا موجودہ نظام ختم ہو جائے گا۔ دوسرے مرحلے پر پھر حضرت اسرافیل علیہ السلام صور پھونکیں گے جس پر تمام مردے زندہ ہو جائیں گے اور اپنی قبروں سے نکل پڑیں گے اور کائنات ایک نئے نظام کے تحت موجود ہوگی۔ اس دن کو يَوْمُ الْبَعْث کہا جاتا ہے جسے اس سورت میں وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک اور مرحلہ ہے جس میں تمام لوگوں کے اعمال کا جائزہ لیا جائے گا اور ہر شخص کے سامنے اس کا نامہ اعمال رکھ دیا جائے گا وہ اچھے یا برے اعمال جو اس نے اپنی زندگی میں کیے اور اچھے یا برے اعمال جن کی وہ بنیاد رکھ گیا سب اس کے نامہ اعمال میں درج ہوں گے۔ اس نامہ اعمال کو اللّٰہ کے معزز فرشتے جو کراماً کاتبین کہلاتے ہیں پوری تفصیل کے ساتھ لکھتے رہتے ہیں۔ یہ اعمال نامے نیک لوگوں کے داہنے ہاتھ میں اور برے لوگوں کے بائیں میں دیئے جائیں گے اور عدل وانصاف کے تمام تقاضے پورے کیے جائیں گے۔ اس سورت میں اسی عقیدہ حساب اور جزا وسزا کو عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّاقَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اگلی آیات میں اللّٰہ تعالیٰ انسان سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے کہ اے انسان تجھے اپنے مہربان رَبّ کے بارے میں کس چیز نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے اور تو نے اپنے باعظمت خدا سے کس لیے بے پروائی برت

رکھی ہے؟ کیا تجھے شیطان یہ دھوکہ دیتا ہے کہ رَبّ تعالیٰ مہربان ہے وہ قیامت کے دن بھی کرم فرمائے گا اور کوئی حساب نہ لیا جائے گا۔ تیرا فرض تھا کہ خدا کی مہربانیوں کو دیکھ کر اس کا شکر گزار بندہ بنتا۔ وہ خدا جو تجھے عدم سے وجود میں لایا تجھے اپنی مخلوقات میں عزت بخشی، تیرے اعضاء میں تناسب اور خوبصورتی رکھی اور تجھے مناسب شکل وصورت دے کر پیدا فرمایا اس کا جس قدر بھی شکر کیا جائے کم ہے۔ مگر تو ہے کہ الٹا ناشکری پر تلا ہوا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ تو قیامت کے دن کا منکر ہے اور یوم حساب کو جھٹلاتا ہے اگر تجھے یقینی علم ہوتا کہ ایک دن اللّٰہ کے حضور میں حاضر ہو کر اپنے تمام اعمال کی جواب دہی کرنی ہوگی تو تو شرک، کفر اور گناہ کے قریب بھی نہ پھٹکتا۔ تجھے شاید معلوم نہیں کہ معزز لکھنے والے فرشتے تیرے تمام اعمال کو لکھ رہے ہیں اور تجھ پر بطور نگہبان مقرر ہیں۔ جو کچھ تو کرتا ہے اسے وہ جانتے ہیں اور تیری چھوٹی سے چھوٹی باتوں کو لکھ بھی لیتے ہیں۔ اگر تجھے اس بات کا یقین ہوتا تو تجھے گناہ کرنے کی کبھی ہمت نہ ہوتی۔

یوم الحساب کا آخری مرحلہ اس وقت آئے گا جب نیکوکار جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے جہاں زندگی ہر قسم کے غم واندوہ سے پاک ہوگی اور وہ مثالی زندگی نصیب ہوگی جس کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ہر قسم کا آرام اہلِ جنت کو ملے گا اور کسی قسم کی بیہودگی وہاں دیکھنے میں نہیں آئے گی۔ برخلاف اس کے بدکار لوگ دوزخ میں داخل ہوں گے۔ جہاں ہر قسم کا عذاب ہوگا اور زندگی مصائب ومشکلات کا مجسمہ ہوگی جو لوگ جہنم میں داخل ہوں گے وہ اس سے باہر نہ نکل سکیں گے۔

آخر میں رَبّ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے انسان یوم الحساب کے بارے میں تو کیا جانے کہ وہ کیسا دن ہے۔ تجھے شاید خیال ہو کہ اس دن کوئی کسی کے لیے کچھ کر سکے گا تو یہ خیال غلط ہے۔ اس دن حکم صرف اللّٰہ کا چلے گا اور فیصلہ اسی کا ہوگا۔ یہ معبودانِ باطل اس دن کچھ کام نہ آئیں گے اور تمام جھوٹے اقتدار ختم ہو جائیں گے۔ انسان کا فرض ہے کہ ایسے دن سے غافل نہ رہے۔

(12)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓمّٓ ؁ ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ ۚ ۖۛ فِیۡہِ ۚ ۛ هُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ؁ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ وَیُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ؁ وَالَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ ۚ وَبِالۡاٰخِرَۃِ هُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ ؁ ؕ

''الف لام میم اس کتاب میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں۔ راہ دکھاتی ہے ان پرہیزگاروں کو جو اَن دیکھی چیزوں پر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔ اور جو رزق ان کو ہم نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور وہ ایمان لاتے ہیں اس کتاب پر جو آپ پر نازل کی گئی ہے۔ اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کی گئیں اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں۔''

اُولٰٓئِکَ عَلٰی هُدًی مِّنۡ رَّبِّهِمۡ ٭ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ؁ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ؁

''یہی لوگ اپنے رَبّ کی طرف سے ہدایت پر ہیں۔ اور صرف یہی لوگ مراد کو پہنچنے والے ہیں، بے شک جو لوگ کفر پر جم چکے ہیں ان کے لیے برابر ہے۔ خواہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔''

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ط وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ز وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌo

گویا اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔ اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔''

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَo م يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ج وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ o ط فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ لا فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ج وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ م ۵ لا بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ o وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ لا قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَo اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَo

''اور ان لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور آخرت کے دن پر ایمان لائے حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں۔ وہ اللہ اور ایمان والوں کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں اور سمجھتے نہیں۔''
''ان کے دلوں میں بیماری ہے تو اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھا دی اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ بوجہ اس کے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔ اور جب ان سے کہا جائے کہ زمین میں فساد نہ برپا کرو تو وہ کہتے ہیں ہم تو اصلاح ہی کرنے والے ہیں یاد رکھو بے شک وہی لوگ فسادی ہیں مگر وہ سمجھتے نہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ط اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَo وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ج صلے وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ لا قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَo (البقرہ 2:1-14)

جب ان سے کہا جائے کہ ایمان لاؤ جیسے اور لوگ لائے تو وہ کہتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں جس طرح بے وقوف لوگ ایمان لائے۔ یاد رکھو بے شک یہی ہیں بے وقوف مگر وہ جانتے نہیں۔ اور جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب شیطانوں کے ساتھ اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو بے شک تمھارے ساتھ ہیں ہم تو (مسلمانوں) سے صرف مزاح کرتے ہیں۔''

مشکل الفاظ کے معانی: الٓمّٓ: یہ حروفِ مقطعات کہلاتے ہیں۔ رَیْب: شک و شبہ۔ یُوْقِنُوْنَ: یقین رکھتے ہیں۔ مُفْلِحُوْنَ: کامیابی حاصل کرنے والے، مقصد کو پہنچنے والے۔ (واحد مُفْلِحٌ) سَوَاءٌ: برابر، مساوی۔ اَنْذَرْتَ: تو نے ڈرایا۔ مراد آپ ڈرائیں۔ اَمْ: یا۔ لَمْ تُنْذِرْ: آپ نہ ڈرائیں۔ خَتَمَ: مہر لگا دی، بند کر دیا۔ غِشَاوَةٌ: پردہ۔ یُخٰدِعُوْنَ: دھوکہ دیتے ہیں۔ مُصْلِحُوْنَ: اصلاح کرنے والے، غلط چیز کو درست کرنے والے (واحد مُصْلِحٌ) یَشْعُرُوْنَ: شعور رکھتے ہیں۔ جانتے ہیں۔ اَلْمُفْسِدُوْنَ: فسادی، فساد برپا کرنے والے (واحد مُفْسِدٌ) اَلسُّفَهَآءُ: بے وقوف لوگ (واحد سَفِيْهٌ) اِذَا لَقُوْا: جب ملاقات کرتے ہیں۔ اِذَا خَلَوْا: جب اکیلے ہوتے ہیں۔ الگ ہوتے ہیں۔ شَیٰطِیْنُ: بدمعاش، ساتھی، منافقین اور کفار۔ مُسْتَهْزِءُوْنَ: مزاح کرنے والے، ہنسی اُڑانے والے (واحد مُسْتَهْزِئٌ)۔

تشریح: قرآن کریم تمام شک و شبہات سے پاک کتاب ہے۔ یہ کتاب بنی نوع انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے نازل ہوئی۔ اس کو قبول کرنے اور نہ کرنے کے لحاظ سے سارے انسان تین گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ پہلا گروہ ان لوگوں کا ہے جنھوں نے اس کتاب کو اللہ کی کتاب سمجھ کر اپنے سینے سے لگایا۔ اس کے اوامر پر سختی سے عمل کیا اور اس کی نواہی سے اجتناب کیا۔ یہ لوگ قرآنی اصطلاح میں متقی کہلاتے

ہیں۔یہی وہ گروہ ہے جس نے اللہ کی ہدایت سے کماحقہ فائدہ اُٹھایا ہے۔برخلاف اس کے دوسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جنھوں نے قرآن مجید کو کتاب اللہ ماننے سے انکار کر دیا۔ان پر رسول اللہ ﷺ کی تبلیغ اور آنے والے عذاب سے تہدید بالکل بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ گویا ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگ گئی ہے اور آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے۔ان کے دل اچھی بات کو قبول کرنے اور کان اچھی بات کو سننے اور آنکھیں نیکی اور ہدایت کی راہ دیکھنے کے قابل نہیں ہیں۔یہ کافروں کا گروہ ہے قیامت کے دن ان کو زبردست عذاب دیا جائے گا۔

تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو زبانی طور پر تو ایمان لے آئے لیکن دل سے وہ اب بھی کافر ہیں۔ان کے ظاہر اور باطن میں تضاد ہے۔یہ اسلام کے عروج کو دیکھ کر مسلمانوں میں شامل تو ضرور ہو گئے ہیں لیکن درحقیقت وہ کافر ہیں۔اسلام کے خلاف طرح طرح کی ریشہ دوانیاں کرتے ہیں۔یہ منافقین کا گروہ ہے۔نفاق ایک قلبی بیماری ہے۔ان کی سرکشی کے باعث اس بیماری میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ان کا خیال ہے کہ اس منافقت کی وجہ سے ان کو کچھ فائدہ پہنچ جائے گا لیکن ایسا ممکن نہیں ہے۔ایسے لوگ اصلاح کے پردے میں فساد برپا کرتے ہیں اور ایمان کا لبادہ اوڑھ کر مسلمانوں کی توہین کرتے ہیں اور ان کو بیوقوف سمجھتے ہیں۔اس نفاق سے نقصان صرف انھی کو پہنچ رہا ہے۔وہ اللہ یا مسلمانوں کو بے وقوف نہیں بنا رہے بلکہ اپنی نادانی کے باعث خود بے وقوف بن رہے ہیں۔

ان آیات کے ابتدائی حصے میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ قرآن مجید سے پورا فائدہ اُٹھانے والے وہ لوگ ہیں جن میں یہ صفات موجود ہوں۔

1۔ تقویٰ: ان کے دلوں میں خوفِ خدا موجود ہو‘ نیک و بد میں وہ تمیز کرتے ہوں اور ہدایت کی تلاش میں کوشاں ہوں‘ قرآن حکیم کو ہدایت کا سرچشمہ سمجھتے ہوں۔
2۔ جو غیر محسوس اور غیر مادی چیزوں پر عقیدہ رکھتے ہوں۔مثلاً خدا کی ذات وصفات‘ ملائکہ‘ وحی‘ جنت ودوزخ وغیرہ پر ان کا مکمل ایمان ہو۔
3۔ احکامِ قرآنی پر عمل پیرا ہوں۔تمام عبادات کو نہایت پابندی سے ادا کرتے ہوں۔یہاں صرف اہم عبادات کا ذکر ہوا ہے کیونکہ نماز اہم ترین عبادت ہے جس میں امیر اور غریب کی تفریق نہیں۔
4۔ نماز کے ساتھ زکوٰۃ بھی ادا کرتے ہوں۔یہاں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ جو کچھ ان کے پاس ہے اللہ کا دیا ہے اس لیے انھیں اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے زکوٰۃ ادا کرنے یا مساکین کی مدد کرنے میں کوئی حیل وحجت نہیں کرنا چاہیے۔
5۔ وہ قرآن کریم اور اس سے پہلے نازل شدہ کتابوں مثلاً تورات‘ زبور اور انجیل کو بھی برحق مانتے ہوں۔
6۔ وہ آخرت کے دن پر یقین رکھتے ہوں۔یَوْمُ الْقِيَامَة‘ یَوْمُ البَعْث اور یَوْمُ الحِسَاب پر ان کا ایمان ہو۔

ایسے لوگوں کے بارے میں ربّ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں اور کامران ہیں۔

(13)

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى

’’ساری نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرو بلکہ ساری نیکی (اس نے کمائی) جو اللہ پر‘ قیامت پر‘ فرشتوں پر کتابوں پر اور نبیوں پر ایمان لایا اور جس نے مال اللہ کی محبت میں

وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○ (البقرة 2:177)

رشتہ داروں یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوال کرنے والوں اور گردنیں چھڑانے والوں کو دیا اور جس نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی۔ اور وہ جو اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہیں جب عہد کرلیں اور وہ جو تنگی، بیماری اور جنگ کی حالت میں صبر کرنے والے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے قول و عمل میں سچ کر دکھایا اور یہی لوگ پرہیزگار ہیں۔"

مشکل الفاظ کے معانی: بِرٌّ: نیکی، بھلائی۔ اَنْ تُوَلُّوْا: کہ تم پھیرو۔ وُجُوْہٌ: منہ، چہرے (واحد وَجْهٌ) قِبَلَ: جانب۔ اٰتٰی: دیا۔ ذَوِی الْقُرْبٰی: رشتے دار، قربت والے۔ اِبْنُ السَّبِيْل: مسافر، راہگیر۔ رِقَاب: گردنیں۔ (واحد رَقَبَةٌ) مراد غلامی یا قرض سے گردنیں چھڑانے والے۔ مُوْفُوْنَ۔ پورا کرنے والے (واحد مُوْفِیْ) اَلْبَاْسَآءُ: تنگی، غربت۔ اَلضَّرَّآءُ: بیماری، جانی مالی نقصان۔ اَلْبَاْسُ: سختی، جنگ۔ صَدَقُوْا: سچ کر کے دکھایا، سچ کہا۔

تشریح: اس آیت میں اجزاء ایمان، کچھ ارکانِ اسلام اور بعض اہم اخلاق کو بڑے مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ربّ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ محض رسمی طور پر کسی چیز کو مان لینے یا کسی حکم پر عمل کر لینے سے کچھ حاصل نہیں اور نیکی صرف اسی کا نام نہیں کہ مشرق یا مغرب کی طرف منہ کرلیا جائے بلکہ نیکی خلوص کے ساتھ ایمان لانے اور عمل کرنے کا نام ہے۔ اعتقادات کی درستی کے بغیر کوئی عبادت کام کی نہیں۔ انسان کو چاہیے کہ اللّٰہ پر، قیامت پر، فرشتوں پر خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی کتابوں پر اور تمام انبیاء علیہم السّلام پر سچے دل سے ایمان لائے۔

بھلائی اور نیکی کمانے کے لیے ضروری ہے کہ اپنا پیارا مال خدا کی خوشنودی کی خاطر مندرجہ ذیل مستحقین پر خرچ کرے۔

1۔ ذَوِی الْقُرْبٰی: صدقات وخیرات کے سب سے زیادہ مستحق اپنے غریب رشتہ دار ہیں قرآن کریم نے بھی انھیں پہلے نمبر پر رکھا۔

2۔ اَلْيَتَامٰی: رشتہ داروں کے بعد صدقات کے مستحق یتیم ہوتے ہیں جن کے سر سے ان کے باپ کا سایہ بچپن ہی سے اُٹھ گیا ہو۔

3۔ اَلْمَسَاكِيْنَ: تیسرے نمبر پر مسکین لوگ آتے ہیں۔ مسکین ایسا شخص ہوتا ہے جسے امداد کی ضرورت ہو اور اس پر زکوٰۃ فرض نہ ہو۔

4۔ اِبن السَّبِيْل: چوتھے نمبر پر مسافر آتے ہیں۔ جنھیں دورانِ سفر مالی امداد کی ضرورت پیش آئے۔ خواہ وہ اپنے وطن میں امیر کیوں نہ ہو۔

5۔ اَلسَّآئِلِيْنَ: پانچویں نمبر پر وہ لوگ ہیں جو مالی امداد کے خواہاں ہوں اور محتاجی نے انھیں سوال کرنے پر مجبور کر دیا ہو۔ ایسے سائلوں کی امداد کرنا ثواب کا کام ہے اور انھیں سختی سے جواب دینے کی ممانعت ہے۔ قرآن کریم میں ایسے سائلوں کے لیے آیا ہے:

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ (الضحیٰ) "مانگنے والے کو مت جھڑکیے" بلکہ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ایسے لوگوں کی مدد کی جائے۔ جو محتاج ہونے کے باوجود کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتے۔ ان کے چہرے احتیاج اور تنگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمَاهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (البقرہ) تو انھیں ان کی صورت سے پہچان لے گا وہ لوگوں سے چمٹ کر نہیں مانگتے۔ (ایسے لوگ امداد کے زیادہ حق دار ہیں)۔

6۔ اَلرِّقَاب: غلامی یا قرض کے بوجھ سے اپنے آپ کو آزاد کرانے والے بھی مالدار لوگوں کی امداد کے مستحق ہیں۔ اسلام جب دُنیا میں آیا تو غلامی کا دَور دَورہ تھا۔ اسلام نے ایسی تدابیر اختیار کیں کہ غلامی رفتہ رفتہ ختم ہوتی گئی۔ اسلام نے غلاموں کی رہائی میں خرچ کرنے کی

تاکید فرمائی اور مختلف گناہوں کا کفارہ غلام آزاد کرنا قرار دیا۔

اس آیت میں مالی امداد کے مستحقین کا ذکر کرنے کے بعد جسمانی اور مالی عبادات میں سے نماز اور زکوٰۃ کا ذکر کیا گیا۔ اسلامی ارکان میں جو مقام نماز اور زکوٰۃ کو حاصل ہے وہ کسی پر مخفی نہیں۔ اگر ایک مسلمان نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی میں سستی نہیں کرتا تو دیگر تمام فرائض وواجبات کی ادائیگی میں سستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے خداوند عالم نے فرمایا کہ حقیقی نیکی انھوں نے کی جنھوں نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی۔

عبادات کے بعد اخلاق کا ذکر ہے۔ اخلاق میں بھی دو اہم ترین باتوں کا ذکر ہوا ہے۔ ایفاء عہد اور صبر۔ ایک کا تعلق قول سے ہے اور دوسرے کا عمل سے یعنی مسلمان قول اور عمل دونوں لحاظ سے بلند درجے پر فائز ہوں۔

1۔ ایفائے عہد: جب وعدہ کیا جائے تو پورا کیا جائے۔ اَوۡفُوۡا بِالۡعَهۡدِ اِنَّ الۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡـُٔوۡلًا (عہد پورا کرو کیونکہ تم سے (قیامت کے دن) عہد کے بارے میں باز پرس ہوگی) ایک مسلمان کو عہد کا پکا اور قول کا دھنی ہونا چاہیے۔ یہ نہیں کہ کہے کچھ اور کرے کچھ۔ رسول کریم ﷺ نے منافق کی تین علامات بتائی ہیں۔ جن میں ایک علامت یہ بھی ہے کہ اِذَا وَعَدَ اَخۡلَفَ جب وعدہ کرے تو اس کو پورا نہ کرے اور اس کی خلاف ورزی کرے۔

2۔ صبر: اس آیت میں صبر کے تین بہت کڑے اور سخت مواقع بیان ہوئے ہیں۔ اول جب مالی تنگی پہنچے (اَلۡبَاۡسَآءِ) دوم جب کوئی بیماری لاحق ہو۔ (اَلضَّرَّآءِ) اور سوم جب میدان میں گھمسان کی لڑائی ہو (اَلۡبَاۡس) تو صبر واستقلال اور اولوالعزمی بلند صفات ہیں۔ جو شخص بھی ان صفات سے متصف ہوگا کامیابی اور کامرانی اس کے قدم چومے گی۔ اس امر کی طرف اس مشہور آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ: بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یعنی اس کی امداد صبر کرنے والوں کے شاملِ حال ہے۔

آخر میں فرمایا گیا کہ جو افراد صدق دل کے ساتھ ان عقائد کو اور پابندی کے ساتھ ان عبادات کو اور خلوص کے ساتھ ان اخلاق کو اپنائیں وہی صحیح معنوں میں سچے ہیں اور ایسے ہی لوگ متقی کہلانے کے حق دار ہیں۔

(14)

مَثَلُ الَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنۡۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ فِىۡ كُلِّ سُنۡۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ○

''ان لوگوں کی مثال جو اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ ایسی ہے جیسے ایک دانہ کہ اس سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو سو دانے ہوں۔ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے اور بھی بڑھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا ہے علیم ہے۔

اَلَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتۡبِعُوۡنَ مَآ اَنۡفَقُوۡا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًى ۙ لَّهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ○

جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر خرچ کر کے احسان نہیں جتاتے اور نہ ہی دل آزاری کرتے ہیں ان کے لیے ان کے رَبّ کے پاس ان کا اجر ہے۔ انھیں نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ وَّمَغۡفِرَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ صَدَقَةٍ يَّتۡبَعُهَآ اَذًى ؕ

خوش کلامی اور درگزر اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری ہو۔

وَاللّٰہُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ٥ (البقرہ 263:2612) اور اللہ بہت بے نیاز ہے نہایت تحمل والا ہے۔''

مشکل الفاظ کے معانی: یُنفِقُوْنَ: خرچ کرتے ہیں۔ حَبَّۃٍ: دانہ۔ سَنَابِلَ: بالیاں، خوشے (واحد سُنْبُلَۃٌ) یُضٰعِفُ: بڑھاتا ہے، دوگنا کرتا ہے۔ مَنًّا: منت، احسان۔ اَذًی: ایذا، تکلیف۔

تشریح: ان آیات میں انفاق فی سبیل اللہ یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ ایک نہایت دلنشین مثال کے ذریعے یہ بتایا گیا ہے کہ جس طرح ایک دانہ بونے سے ایک پودا نکلے اور اس میں سات بالیاں لگیں اور ہر بالی میں سو سو دانے ہوں اور یوں ایک دانہ بونے سے کسان کو سینکڑوں دانے مل جائیں۔ بالکل اسی طرح اللہ کی راہ میں خرچ کیے ہوئے مال کا اجر بھی سات سو گنا ملتا ہے۔ جو ہستی ایک دانے سے سینکڑوں دانے پیدا کرسکتی ہے۔ اس کے لیے کیا مشکل ہے کہ اپنی راہ میں مال خرچ کرنے والے کو اتنا ہی بدلہ دے دے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں کس چیز کی کمی ہے۔ اللہ تو بہت وسعت والا ہے۔ مال جتنے خلوص کے ساتھ خرچ کیا جائے گا اتنا ہی زیادہ ثواب ملے گا۔ اللہ تعالیٰ چونکہ لوگوں کی نیتوں اور ارادوں سے بھی واقف ہے اس لیے لوگوں کی نیتوں کے مطابق اجر عطا فرماتا ہے اور جس کا چاہتا ہے سات سو گنا سے بھی زیادہ ثواب بڑھا دیتا ہے۔

دوسری آیت میں ربِّ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں اور پھر اس کا احسان نہیں جتاتے اور نہ ہی دل آزاری کرتے ہیں کہ احسان جتا کر جن پر مال خرچ کیا ہے۔ انھیں شرمندہ کرتے رہیں ایسے لوگوں کے لیے اللہ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے۔ اور قیامت کے دن انھیں کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

تیسری آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ خوش کلامی اور درگزر سے کام لینا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد سائل یا مسکین کو تکلیف دی جائے۔ بعض اوقات ضدی سائل تنگ کرتے ہیں اور انسان ان کی خدمت دل سے کرنا نہیں چاہتا۔ ایسی صورت میں خوش کلامی سے انھیں ٹال دینا اس امداد سے بہتر ہے جس کے بعد انھیں برا بھلا کہہ کر ذہنی تکلیف پہنچائی جائے۔ جیسے اللہ کی ذات غنی ہے اور حلیم ہے اسی طرح انسان کو مستغنی اور متحمل مزاج ہونا چاہیے۔

(15)

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِالْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ ج اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْفَقِیْرًا فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا قف فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا ج وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْتُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا٥

(النساء 135:4)

''اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے اللہ کے لیے گواہی دینے والے بنے رہو اگرچہ اپنی ہی ذات کے خلاف ہو یا والدین اور رشتہ داروں کی مخالفت میں ہو۔ وہ شخص امیر ہو یا غریب (تم اس بات کا خیال نہ کرو) پس اللہ کا ان دونوں کے ساتھ تم سے زیادہ تعلق ہے پس تم خواہشِ نفس کی پیروی نہ کرو ایسا نہ ہو کہ حق سے ہٹ جاؤ اور اگر تم لگی لپٹی بات کرو گے یا سچائی سے پہلو تہی کرو گے (تو جان لو) کہ بلاشبہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کی خوب خبر رکھنے والا ہے۔''

مشکل الفاظ کے معانی: کُـوۡنُوۡا: تم ہو جاؤ۔ قَـوّٰمِیۡنَ: خوب قائم رہنے والے، مضبوطی سے جمے رہنے والے (واحد قوّامٌ) قِسۡط: عدل وانصاف۔ لَوۡ: اگرچہ۔ عَلٰی: پر، برخلاف۔ اَقۡرَبِیۡنَ: رشتے دار، نزدیک ترین بلحاظ رشتہ (واحد اَقۡرَبُ) لَاتَتَّبِعُوۡا: پیروی نہ کرو۔ اَلۡھَوٰی: خواہشِ نفس۔ اِنۡ تَـلۡوٗآ: اگر تم زبان کو مروڑو گے۔ الفاظ کو منہ بگاڑ کر یا الفاظ کے ہیر پھیر میں سچ کو چھپاؤ گے۔ تُـعۡرِضُوۡا: تم روگردانی کرو گے، پہلو تہی کرو گے، یعنی گواہی دینے سے اعراض کرو گے۔

تشریح: اس آیت میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ حق وانصاف کے علمبردار بنیں اور اللہ کی رضا کی خاطر سچی گواہی دینے والے بن جائیں۔ عدل وانصاف پر کائنات کے امن کا دارومدار ہے۔ اس لیے اسلام اس پر بہت زیادہ زور دیتا ہے چونکہ انصاف کی بنیاد شہادت پر ہے۔ اگر گواہی دینے والا حقیقت کو ظاہر نہ کرے تو حاکم کے لیے انصاف کرنا ناممکن ہے۔ اس لیے قرآن کریم کی اس آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ شہادت محض اللّٰہ کی خوشنودی اور انصاف کے قائم کرنے کے لیے ہو۔ گواہی دیتے وقت یہ خیال نہ رکھو کہ کس کو فائدہ پہنچے گا اور کس کو نقصان۔ گواہی سے اپنے آپ کو نقصان ہو یا والدین اور رشتہ داروں کو نقصان پہنچے اس بات کی پرواہ نہ کرو بلکہ حقیقت کو بیان کرو۔ اسی طرح گواہی دیتے وقت کسی کی امیری یا غریبی کا بھی خیال نہ کرو اور یہ مت سمجھو کہ سچی گواہی سے امیر ناراض ہو جائے گا یا غریب کا نقصان ہو جائے گا۔ یاد رکھو امیر اور غریب سب خدا کے بندے ہیں اور اللّٰہ تعالیٰ کا ان دونوں کے ساتھ تمھارے مقابلے میں زیادہ تعلق ہے۔ اگر اپنے پرائے یا امیر اور غریب کا گواہی دیتے وقت یا حکم سناتے وقت خیال آ جائے تو انصاف کا حصول ناممکن بن جائے گا جس سے کائنات میں ظلم اور فساد کا دور دورہ ہوگا۔ اس لیے شہادت کے وقت اپنی خواہشات کی پیروی بھی نہ کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ خواہش کے اتباع میں حق سے ہٹ جاؤ اور انصاف نہ کر سکو۔

یہ بھی یاد رکھو کہ گول مول گواہی دے کر حق کو چھپانے کی کوشش بھی نہ کرو اور شہادت کے لیے اگر بلایا جائے تو پہلو تہی مت کرو اور اعراض سے کام نہ لو۔ اگر ایسا کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال کو خوب جاننے والا ہے۔ الغرض اس آیت میں نظامِ شہادت کے زریں اُصول بیان ہوئے ہیں۔

1۔ شہادت انصاف پر مبنی ہو۔
2۔ شہادت میں صرف اللہ کی خوشنودی مطلوب ہو۔
3۔ گواہی دینے میں کسی فریق کی مالی حیثیت کو پیشِ نظر نہ رکھا جائے۔
4۔ شہادت میں کسی کے نفع یا نقصان کا خیال نہ رکھا جائے۔
5۔ اپنی خواہش اور مرضی کو شہادت میں حائل نہ ہونے دیا جائے۔
6۔ گواہی کے الفاظ واضح ہوں اور صورتحال پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہوں۔ گول مول بات کر کے حقیقت کو چھپانے سے اجتناب کیا جائے۔
7۔ جب گواہی کے لیے بلایا جائے تو حیلے بہانے سے جان چھڑانے اور پہلو تہی کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ ایسا کرنا کسی صورت میں درست نہیں۔

(16)

وَمَنۡ يَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيۡهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيۡمًا○ (النساء 93:4)

''اور جو شخص کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کر ڈالے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اللہ اس پر غضبناک ہوا اور اس پر لعنت کی اور اس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

مشکل الفاظ کے معانی: مُتَعَمِّدًا: قصداً، جان بوجھ کر۔ جَزَآء: بدلہ، سزا، خَالِدًا: ہمیشہ رہنے والا۔ اَعَدَّ: تیار کیا۔

تشریح: اس آیت میں قتل عمد کی سزا بیان ہوئی ہے یہ وہی سزا ہے جو قرآن نے کافروں کے لیے بتائی ہے۔ اس آیت کو پڑھ کر مسلمان کا دل لرز اُٹھتا ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرنے والے پر خدا غصے ہوتا ہے اسے اپنی رحمت سے دور کر دیتا ہے اور بڑا عذاب اس کے لیے تیار کرتا ہے اور اسے اس گناہ کے بدلے دوزخ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا (ہاں اگر اللہ خود چاہے تو اسے دوزخ سے نکال لے)۔

اتنی سخت سزا اس لیے ہے کہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر سب سے بڑا حق اس کی جان کا احترام ہے۔ اگر ایک مسلمان اپنے مسلمان بھائی کو جان بوجھ کر قتل کر دیتا ہے تو گویا اس نے حقوق العباد میں سب سے بڑے حق کو تلف کر دیا ہے جس کی تلافی و اصلاح کی اب کوئی شکل باقی نہیں رہی۔ کیونکہ مقتول تو دُنیا سے رخصت ہو چکا اور اس کے ساتھ کی گئی زیادتی کی تلافی کی کوئی صورت نہیں رہی، اس لیے ایسے قاتل کے لیے خوفناک اور دردناک عذاب ہے۔ اسلام میں انسانی خون کی بڑی اہمیت ہے۔ ایک آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اگر کسی شخص نے کسی کو قتل کیا بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا ملک میں فساد برپا کیا ہو تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر ڈالا۔

اسلام کا سب سے بڑا مشن پرامن معاشرے کا قیام ہے جس میں اخوت و مساوات اور عدل و انصاف کا دور دورہ ہو۔ ایک ہی نظریے کے ماننے والے، ایک خدا، ایک رسول اور کتاب پر ایمان رکھنے والے اگر ایک دوسرے کے خون سے ہاتھ رنگنے لگیں تو اس سے بڑھ کر اسلام کو اور کیا نقصان پہنچایا جا سکتا ہے۔

(17)

اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰى مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَاَمۡوَالَهُمۡ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ فَيَقۡتُلُوۡنَ وَيُقۡتَلُوۡنَ قف وَعۡدًا عَلَيۡهِ حَقًّا فِى التَّوۡرٰٮةِ وَالۡاِنۡجِيۡلِ وَالۡقُرۡاٰنِ ؕ وَمَنۡ اَوۡفٰى بِعَهۡدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَيۡعِكُمُ الَّذِىۡ بَايَعۡتُمۡ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ○

''بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کے جان و مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پس قتل کرتے ہیں اور (کبھی) قتل ہو جاتے ہیں۔ اللہ کے ذمے یہ ایک سچا وعدہ ہے جو تورات، انجیل اور قرآن میں ہے۔ اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے کا پورا کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے۔ پس تم خوش ہو جاؤ اس سودے پر جو تم نے اس (اللہ) سے کیا ہے۔ اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝

(التوبۃ:9:111-112)

وہ (غازی) توبہ کرنے والے' عبادت کرنے والے' اللّٰہ کی تعریف کرنے والے' اللّٰہ کی خاطر سفر کرنے والے' رکوع کرنے والے' سجدہ کرنے والے' نیکی کا حکم دینے والے اور بدی سے روکنے والے اور اللّٰہ کی حدوں یعنی احکام کا خیال رکھنے والے ہیں۔ان مومنوں کو خوشخبری سنا دیجئے۔''

مشکل الفاظ کے معانی: اِشْتَرٰی: خرید لیا' خریدا۔ یُقَاتِلُوْنَ: لڑائی کرتے ہیں۔ یُقْتَلُوْنَ: قتل کیے جاتے ہیں۔ اِسْتَبْشِرُوْا: خوش ہو جاؤ۔ سَائِحُوْنَ: اللّٰہ کی خاطر سفر کرنے والے یعنی جہاد' تبلیغِ دین یا طلبِ علم کی خاطر سفر کرنے والے (واحد سَائِحٌ) بَشِّرْ: خوشخبری سنایئے۔

تشریح: یہ دو آیتیں سورہ توبہ کی ہیں۔ پہلی آیت میں رَبّ تعالیٰ نے مومنوں کو بڑے مؤثر طریقے سے اپنی جانیں اور اپنے مال اللّٰہ کی راہ میں قربان کرنے کی ترغیب دی ہے اور دوسری آیت میں مجاہدینِ اسلام کی اعلیٰ صفات کا ذکر فرمایا ہے۔

اللّٰہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو یہ بات سمجھائی کہ تم اپنی جان و مال کے مالک نہیں ہو کیونکہ اللّٰہ نے جنت کے بدلے تم سے یہ خرید لیے ہیں۔ اب یہ سب کچھ تمھارے پاس اللّٰہ کی امانت ہے۔ اللّٰہ جیسے چاہے ان میں تصرف کا حق رکھتا ہے۔ لڑائی کے وقت جان بچانا یا مال خرچ کرنے سے کترانا معاہدے کے خلاف ہے۔ ویسے بھی خدا کو خالق و مالک ہونے کی حیثیت سے تمھاری جان اور دولت پر حقِ ملکیت حاصل تھا مگر اب تم نے اسلام قبول کر کے اپنی عارضی ملکیت کو بھی ختم کر ڈالا ہے اور جنت کے بدلے فروخت کر دیا ہے۔ اب بھی اگر تم منافقین کی طرح جان بچاؤ یا مال قربان کرنے سے گھبراؤ تو یہ اللّٰہ کے ساتھ کیے ہوئے سودے کے خلاف ہے۔

تمھارا یہ سودا بڑی کامیابی ہے۔ اس سودے میں تم نے کھویا کچھ نہیں بلکہ کمایا ہی کمایا ہے کیونکہ اللّٰہ کے دیئے ہوئے مال اور جان کو جنت کے بدلے فروخت کیا ہے۔ یوں تم نے دیا کچھ نہیں' لیا ہی لیا ہے۔ اس سودے پر تم خوشیاں مناؤ۔ حقیقت یہ ہے کہ تم نے یہ سودا کر کے بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔

دوسری آیت میں بتایا گیا کہ مجاہدینِ اسلام صرف تلوار کے دھنی ہی نہیں بلکہ اپنی ادنیٰ سی لغزش پر توبہ کرنے والے' عبادت گزار' اللّٰہ کی ہر گھڑی حمد و ثنا کرنے والے' اللّٰہ کی راہ میں سفر کرنے والے' رکوع و سجود کرنے والے' نیکی کا حکم کرنے والے اور بدی سے روکنے والے اور تمام احکامِ الٰہیہ کی پوری پابندی کرنے والے ہیں۔ یہ مجاہدین اپنی زندگی پوری طرح اسلام کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ ایسے مجاہدین اور مومنین کے لیے جنت کی بشارت ہے۔

(18)

وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ کِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْ هُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا ؕ ۝

''اور تمھارے رَبّ نے حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ اگر تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں ان میں سے ایک یا دونوں تو انھیں ہاں ہوں تک نہ کہنا اور انھیں مت جھڑکنا اور ان سے شائستگی سے بات کرنا۔ اور نرمی اور تواضع کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہنا اور دُعا کرتے رہنا' اے میرے رَبّ ان پر رحم فرما۔ جس طرح انھوں نے مجھے بچپن میں (محبت سے) پالا۔

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِیْ نُفُوْسِكُمْ ط اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِیْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا٥

تمھارا ربّ خوب واقف ہے اس سے جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے۔ اگر تم نیک ہو گے تو وہ ایسے لوگوں کو بخشنے والا ہے جو اس کی طرف پلٹ کر آنے والے ہیں۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا ٥ اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ط وَكَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ٥ وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّیْسُوْرًا٥

رشتہ دار کو اس کا حق دیجئے اور مسکین مسافر کو بھی (ان کا حق دیجئے) اور فضول خرچی نہ کیجئے۔ بے شک فضول خرچ شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے ربّ کا بڑا ناشکرا ہے۔ اگر تو ان سے منہ پھیرے اس رزق کے انتظار میں جس کی تجھے اپنے ربّ کی طرف سے آنے کی اُمید ہو۔ تو ان سے نرمی سے بات کیجئے۔

وَلَا تَجْعَلْ یَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا٥

اور نہ ہی اپنا ہاتھ گردن سے باندھ کر رکھیے یعنی کنجوس نہ بن جایئے اور نہ ہی اسے بالکل کھلا چھوڑ دیجئے یعنی فضول خرچ نہ بن جایئے کہ تو ملامت زدہ اور عاجز بن کر بیٹھ جائے۔

اِنَّ رَبَّكَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ ط اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرًا م بَصِیْرًا٥ ع

بے شک تیرا ربّ جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے۔ اور جس کے لیے چاہتا ہے رزق تنگ کرتا ہے بے شک وہ اپنے بندوں کی خوب خبر رکھنے والا ہے سب کچھ دیکھنے والا ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْیَةَ اِمْلَاقٍ ط نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِیَّاكُمْ ط اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِیْرًا٥

تم اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم انھیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمھیں بھی۔ بے شک انھیں قتل کرنا بہت بڑا جرم ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ط وَسَآءَ سَبِیْلًا٥

اور تم زنا کے قریب بھی مت جاؤ یقیناً وہ بے حیائی ہے اور بری راہ ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ط وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ ط اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا٥

اور اس جان کو قتل نہ کرو جس کے قتل کو اللّٰہ نے حرام قرار دیا۔ مگر حق کے ساتھ اور جو ظلم سے قتل کیا گیا، پس ہم نے اس کے ولی کو قصاص کا اختیار دیا ہے۔ اسے چاہیے کہ قتل میں حد سے نہ بڑھے۔ بے شک مظلوم کی مدد ہونی ہے

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ حَتّٰى یَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ص وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ج اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا٥ وَاَوْفُوا الْكَیْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ ط ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا٥

اور تم یتیم کے مال کے بھی قریب نہ جاؤ مگر اس طریقے سے جو اس کے حق میں بہتر ہو یہاں تک کہ وہ شباب کو پہنچ جائے اور عہد کو پورا کرو یقیناً عہد کے بارے میں بھی پوچھا جائے گا اور جب ناپو تو پورا ناپو اور ٹھیک ترازو کے ساتھ تولو یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بھی اچھا ہے۔

وَلَا تَقۡفُ مَا لَيۡسَ لَکَ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ اِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنۡهُ مَسۡئُوۡلًا○
وَلَا تَمۡشِ فِی الۡاَرۡضِ مَرَحًا ۚ اِنَّکَ لَنۡ تَخۡرِقَ الۡاَرۡضَ وَلَنۡ تَبۡلُغَ الۡجِبَالَ طُوۡلًا○
کُلُّ ذٰلِکَ کَانَ سَیِّئُهٗ عِنۡدَ رَبِّکَ مَکۡرُوۡهًا○
(بنی اسرائیل:17:23-38)

اور جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے مت پڑ۔ بے شک کان' آنکھ اور دل ان سب سے باز پرس ہونی ہے۔
اور زمین پر اکڑ کر مت چل' بے شک تو کبھی بھی زمین کو نہ پھاڑ سکے گا۔ اور بلندی میں پہاڑوں کو نہ پہنچ سکے گا۔
یہ سارے برے کام تیرے رَبّ کے نزدیک بالکل ناپسندیدہ ہیں۔"

مشکل الفاظ کے معانی: قَضٰی: حکم دیا' فیصلہ کر دیا۔ یَبۡلُغَنَّ: پہنچ جائے۔ اَلۡکِبَرَ: بڑھاپا' کِلٰهُمَا: وہ دونوں۔ اُفٍّ: کلمۂ بیزاری' ہاں ہوں۔ ایسا کلمہ جس سے نفرت کا اظہار ہو۔ لَاتَنۡهَرۡ: مت جھڑکیے۔ اِخۡفِضۡ: جھکا دیجئے۔ جَنَاح: بازو۔ الذُّلِّ: نرمی' خاکساری' تواضع۔ رَبَّیٰنِیۡ: ان دونوں نے مجھے پالا۔ اَوَّابِیۡنَ: سچے دل سے توبہ کرنے والے' رجوع کرنے والے (واحد اَوَّابٌ) لَاتُبَذِّرۡ: فضول خرچ مت کیجئے۔ مُبَذِّرِیۡنَ: فضول خرچ کرنے والے (واحد مُبَذِّرٌ) اِبۡتِغَاء: چاہنا' انتظار کرنا۔ رَحۡمَةٍ: مراد رزق۔ تَرۡجُوۡ: تو امید رکھتا ہے۔ مَیۡسُوۡر: نرم' آسان۔ مَغۡلُوۡلَة: بندھا ہوا۔ مَحۡسُوۡر: درماندہ' عاجز۔ خَشۡیَة: خوف' ڈر۔ اِمۡلَاق: تنگی' افلاس۔ سُلۡطَان: غلبہ' طاقت' اختیار۔ لَایُسۡرِفۡ: چاہیے کہ وہ زیادتی نہ کرے۔ حد سے نہ بڑھے۔ اَشُدَّ: شباب' سنِ بلوغت۔ قِسۡطَاس: ترازو۔ مُسۡتَقِیۡم: سیدھا۔ تَاۡوِیۡلٌ: انجام۔ لَاتَقۡفُ: پیچھے نہ پڑ۔ مَرَحًا: اکڑ کر' اترا کر۔ لَنۡ تَخۡرِقَ: تو ہرگز نہ پھاڑ سکے گا۔ مَکۡرُوۡهًا: ناپسندیدہ۔

تشریح: سورہ بنی اسرائیل کی ان آیات میں چند اہم ترین تعلیماتِ اسلام کا ذکر کیا گیا ہے۔

1۔ تعلیمِ توحید:

سب سے پہلے توحید کی تعلیم دی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ رَبّ تعالیٰ کا حکم ہے کہ سوائے اس کے کسی کی عبادت نہ کی جائے۔ توحید کو اسلامی تعلیمات میں مرکزی حیثیت حاصل ہے کیونکہ اللہ کو ایک مانے اور صرف اسی کی عبادت کیے بغیر کوئی نیک عمل قبولیت حاصل نہیں کر سکتا۔ بعض لوگ خدا کو ایک مانتے ہیں مگر عبادت میں غیروں کو بھی شریک کرتے ہیں۔ رَبّ تعالیٰ نے پہلی آیت میں صرف اپنی عبادت کا حکم دے کر غیروں کی عبادت کو ممنوع قرار دیا۔

2۔ حقوقِ والدین:

توحید کے بعد والدین کے حقوق کو بھی اسی آیت میں بیان کیا گیا جس سے والدین کے اعلیٰ مرتبے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ والدین کے حقوق کے سلسلے میں درج ذیل امور کی ہدایت کی گئی ہے۔

ا۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک:

اللہ کے فرمان کے مطابق اولاد پر فرض ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئیں۔ خاص کر جب وہ بوڑھے ہو جائیں تو انھیں اپنے لیے بوجھ نہ سمجھیں۔ ان سے محبت و احترام سے بات کریں اور کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکالیں جس سے نفرت کا اظہار ہوتا ہو۔ ہمیشہ

عاجزی اور انکسار کے ساتھ پیش آئیں۔

ب۔والدین کے حق میں دعائے خیر:

یہ بھی اللہ کا حکم ہے کہ والدین کے حق میں دُعا کرتے رہنا چاہیے کہ اے اللہ توان پر رحم فرما جس طرح انھوں نے مجھے بچپن میں محبت سے پالا۔

ج۔دل میں والدین کا احترام:

والدین کا ادب واحترام صرف ظاہری باتوں تک محدود نہ ہونا چاہیے بلکہ دل میں بھی والدین کی عزت ہو اور بے ادبی کا خیال بھی دل میں نہ آئے اگر کبھی والدین کے حق میں گستاخی یا بے ادبی ہو جائے تو فوراً توبہ کرنی چاہیے۔اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کی خطا معاف کر دیتا ہے۔

3۔ رشتہ داروں، غریبوں اور مسافروں کے حقوق:

ان آیتوں میں تیسرا حکم رشتہ داروں، غریبوں اور مسافروں کے حقوق کی ادائیگی کے بارے میں ہے۔فرمایا کہ رشتہ دار کو اس کا حق دو رشتہ داروں کا پہلا حق ان کے ساتھ حسن سلوک ہے۔اگر وہ غریب ہوں تو ان کی مالی امداد بھی ان کے حقوق میں شامل ہے۔ بڑے ہوں تو ادب سے، چھوٹے ہوں تو شفقت کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔ بیمار ہوں تو عیادت کرنا بھی ان کا حق ہے۔رشتہ داروں کے علاوہ دیگر غرباء اور مساکین کی مالی امداد کرنا بھی اسلام میں ضروری ہے۔اسی طرح وہ مسافر جو حالتِ سفر میں امداد کے محتاج ہو گئے ہوں ہمارے مال میں اپنا حق رکھتے ہیں اور ان کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔

4۔ فضول خرچی کی ممانعت:

حق داروں کے حقوق یاد دلانے کے بعد فوراً فضول خرچی سے منع کیا گیا ہے کیونکہ ادائیگی حقوق میں سب سے بڑی رکاوٹ فضول خرچی ہے۔فضول خرچ انسان دوسروں کے حقوق کو پس پشت ڈال کر اپنی ذات پر زیادہ سے زیادہ پیسے خرچ کر دیتا ہے۔قرآن مجید نے فضول خرچ کرنے والوں کو شیطانوں کے بھائی بتایا ہے کیونکہ فضول خرچ اللہ تعالیٰ کا ویسا ہی ناشکرا ہے جس طرح شیطان اللہ تعالیٰ کا ناشکرا ہے۔شیطان کو اللہ تعالیٰ نے دولتِ عقل دے رکھی تھی لیکن اس نے اس دولت کو اطاعتِ الٰہی کے لیے استعمال کرنے کے بجائے نافرمانی اور سرکشی کے لیے استعمال کیا۔اسی طرح فضول خرچ دولت دُنیا کو والدین، رشتہ داروں، غریبوں اور مسافروں کی امداد میں خرچ کرنے کے بجائے بے جا طور پر محض عیش وعشرت پر خرچ کر دیتا ہے اور ناجائز کاموں میں اللہ کی دی ہوئی دولت کو ضائع کرتا ہے۔

5۔ نرم گفتاری کا حکم:

اگر ضرورت مند تم سے سوال کریں اور اس وقت تمھارے پاس دینے کے لیے کچھ نہ ہو اور اس مجبوری کے تحت تمھیں مستحقین سے منہ پھیرنا پڑے تو ان سے درشتی سے پیش نہ آؤ اور ان کے ساتھ توہین آمیز رویہ اختیار نہ کرو بلکہ نہایت نرمی سے سمجھا دو کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے کہ میری یہ تنگ دستی ختم کر دے گا تب میں ضرور تمھاری مدد کروں گا۔

6۔ اخراجات میں میانہ روی:

اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے میں بھی میانہ روی اختیار کرو۔ اتنا نہ خرچ کردو کہ خود پریشانی میں پڑو اور ننگے بھوکے رہ جاؤ اور نہ اتنی تنگی اور کنجوسی کرو کہ خود بھی ذلت کی زندگی گزارو اور معاشرے میں بھی ذلیل اور رسوا ہو جاؤ۔ خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کرو۔ خدا جسے چاہتا ہے کشادہ رزق عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے تنگ رزق دیتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کے بارے میں خوب باخبر ہے اور ان کی سب صلاحیتیں اس کی نظر میں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے درمیان رزق کی تقسیم میں فرق رکھا ہے۔ اس فرق کے پیچھے جو مصلحت کارفرما ہے تم اس کو نہیں سمجھ سکتے۔

7۔ قتلِ اولاد کی ممانعت:

اپنی اولاد کو معاشی تنگی کے خوف سے قتل نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ تمھارا اور تمھاری اولاد کے رزق کا کفیل ہے۔ تمھاری اولاد کو بھی رزق اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے تم نہیں دیتے۔ یہ خیال سراسر غلط ہے کہ کم اولاد ہونے سے خوشحالی کا دوردورہ ہو جائے گا۔

8۔ ممانعتِ زنا:

قتلِ اولاد کے فوراً بعد زنا سے منع فرمایا ہے جس سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اولاد کم کرنے کی کوشش کا لازمی نتیجہ زنا کا عام ہونا ہے۔ فرمایا کہ زنا کے قریب نہ پھٹکو وہ بہت برا فعل ہے۔

9۔ ممانعتِ قتل:

کسی کو ناحق قتل نہ کرو۔ اگر قانون کے مطابق اس کو قتل کی سزا دینی ہے تو یہ حکومتِ وقت کا کام ہے عام مسلمانوں کا نہیں۔ مقتول کے وارثوں کو قصاص لینے کا حق ہے۔ قصاص میں کسی قسم کی زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔ صرف قاتل کو قتل کیا جائے اس کے کسی عزیز کو قتل نہ کیا جائے۔ قتل کرنے سے پہلے یا بعد اس کی ناک کان نہ کاٹے جائیں اور نہ ہی اس کو اذیت دے کر قتل کیا جائے۔

10۔ یتیموں کے مال کی حفاظت کا حکم:

نابالغ یتیموں کے مال و جائیداد میں سے خرچ کرنا حرام ہے البتہ شرعی لحاظ سے خرچ کیا جاسکتا ہے یا یتیم کے فائدے کے لیے تجارت وغیرہ میں اس کا مال لگایا جاسکتا ہے۔

11۔ عہد کی پابندی کا حکم:

عہد کی پابندی کرو جس سے بھی کوئی قول و قرار کرو اس کو پورا ضرور کرو تم سے قیامت کے دن تمھارے قول و قرار کے متعلق دریافت

کیا جائے گا۔

12۔ ناپ تول میں کمی کرنے کی ممانعت:

پورا پورا ناپو اور تولو تو خوب اچھی طرح تولو۔ اس کا انجام دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اچھا ہے۔ پورا ناپنے اور تولنے سے ساکھ بنتی ہے اور کاروبار کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ ثواب بھی دے گا۔ کم ناپنا یا کم تولنا تو بہت بڑا جرم ہے اور حضرت شعیبؑ کی قوم پر اسی جرم میں خوفناک عذاب نازل ہوا تھا۔

13۔ بغیر تحقیق بات کہنے یا کام کرنے کی ممانعت:

تحقیق کیے بغیر محض گمان پر بھروسہ کرتے ہوئے کوئی بات کہنا یا عمل کرنا درست نہیں۔ اس سے معاشرے میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ جب کوئی بات کہنی ہو تو اس کی صحت کا یقین کر لینا چاہیے۔ جو چیز دیکھی نہ ہو اس کے بارے میں یہ مت کہو کہ میں نے دیکھی ہے اور جو سنی نہ ہو اس کے متعلق مت کہو کہ میں نے سنی ہے اور جس چیز کا تمھیں علم نہیں اس کی بابت مت اعلان کرو کہ مجھے اس بات کا علم ہے۔ یاد رکھو قیامت کے دن کان، آنکھ اور دل کے بارے میں بھی سوال ہوگا اور تمھیں اپنے غلط کاموں اور اپنی غلط باتوں کے متعلق جواب دینا ہوگا۔

14۔ غرور اور تکبر کی ممانعت:

ان آیات میں اللہ کا آخری حکم یہ ہے کہ اے انسان زمین پر اترا کر نہ چل۔ اترا کر چلنے سے نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ سینہ تان کر چلنے سے تو پہاڑوں کی بلندی تک پہنچ سکتا ہے۔ پھر تیرا غرور کس کام کا ہے؟ آخر میں فرمایا کہ یہ تمام برے کام تیرے رَبّ کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔ معاشرے میں بھی ان تمام بری باتوں کو برا سمجھا جاتا ہے اور اللہ بھی انھیں ناپسند کرتا ہے۔ پھر اے انسان! تو انھیں چھوڑتا کیوں نہیں؟

(19)

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَ کُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًاۢ بِجَھَالَۃٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَافَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ○ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِیْکُمْ رَسُوْلَ اللّٰہِ ؕ لَوْ یُطِیْعُکُمْ فِیْ کَثِیْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ وَکَرَّہَ اِلَیْکُمُ الْکُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ ؕ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الرّٰشِدُوْنَ○ۙ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَنِعْمَۃً ؕ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ○

"اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق آدمی تمھارے پاس کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کر لیا کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم کو ان جانے نقصان پہنچا دو، پھر تم اپنے کیے پر پشیمان ہو۔ اچھی طرح جان لو کہ تمھارے درمیان اللہ کا رسول موجود ہے۔ اگر وہ اکثر معاملات میں تمھاری بات مان لیا کریں تو تم مشقت میں پڑ جاؤ مگر اللہ نے تمھارے نزدیک ایمان کو محبوب بنا دیا ہے۔ اور اسے تمھارے دلوں میں پسندیدہ کر دیا ہے اور تمھیں کفر، حکم عدولی اور نافرمانی سے متنفر کر دیا ہے۔ یہی لوگ اللہ کے فضل و کرم سے ہدایت پر ہیں اور اللہ خوب جاننے والا ہے حکمت والا ہے۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ج فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِىْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ج فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ط اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَo

اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑیں تو تم ان کے درمیان اصلاح کرا دو۔ پھر اگر ان میں ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو تم زیادتی کرنے والے گروہ سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللّٰہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔ پس اگر وہ پلٹ آئے تو ان دونوں کے درمیان انصاف سے اصلاح کرا دو' اور عدل کرو۔ بے شک اللّٰہ عدل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ ط وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَo ع

بے شک مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ لہٰذا اپنے دو بھائیوں کے درمیان اصلاح کرا دو اور اللّٰہ سے ڈرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ج وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ط بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ج وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَo

اے ایمان والو! کوئی قوم کسی قوم کا مذاق نہ اڑائے' ہو سکتا ہے کہ اس قوم والے ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں عورتوں کا مذاق اڑائیں ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور آپس میں ایک دوسرے پر عیب نہ لگاؤ' اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد فسق کے ساتھ کسی کو منسوب کرنا بہت بری بات ہے اور جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہی ظالم ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ز اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّ لَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ط اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ط وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌo

اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچو۔ یقیناً بعض گمان تو گناہ ہوتے ہیں اور جاسوسی نہ کرو اور نہ تم میں کوئی کسی کی غیبت کرے۔ کیا تم میں سے کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے' پس یہ بات تو تمھیں گوارا نہ ہوگی اور اللّٰہ سے ڈرو۔ بے شک اللّٰہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے' انتہائی مہربان ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ط اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌo

(الحجرات49:6-13)

اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھارے کنبے اور قبیلے بنائے تا کہ تم آپس میں پہچان رکھو۔ بے شک اللّٰہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک اللّٰہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہے خوب خبر رکھنے والا ہے۔"

مشکل الفاظ کے معانی: فَاسِقٌ: نافرمان۔ نَبَاٌ: خبر۔ تَبَيَّنُوْا: خوب تحقیق کرلو۔ لَعَنِتُّمْ: تم ضرور مشقت میں پڑ جاؤ گے۔ حَبَّبَ: محبوب بنا دیا' پیارا بنا دیا۔ كَرَّهَ: مکروہ بنا دیا۔ برا بنا دیا۔ عِصْيَانٌ: نافرمانی۔ تَفِيْءَ: لوٹ آئے' رجوع کرے۔ لَا تَلْمِزُوْا: عیب نہ لگاؤ۔ طعنہ نہ دو۔

لَاتَنَابَزُوْا: (برے ناموں سے) ایک دوسرے کو نہ پکارو۔ لَاتَجَسَّسُوْا: جاسوسی نہ کرو، عیب تلاش نہ کرو۔ لَایَغْتَبْ: (وہ) غیبت نہ کرے۔
شُعُوْب: خاندان، شاخیں (واحد شَعْبٌ) لِتَعَارَفُوْا: تاکہ ایک دوسرے کو پہچان لو۔ اَکْرَمُ: زیادہ عزت والا۔ اَتْقٰی: زیادہ پرہیز گار۔
تشریح: سورہ حجرات کی ان آیات میں اسلامی معاشرت، اخوت اور مساوات کے متعلق چند اہم احکام موجود ہیں۔

1۔ فاسق کی خبر پر عمل کرنے سے قبل تحقیق کی ضرورت:

پہلی آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اگر کوئی فاسق یا شریر انسان تمھیں کوئی خبر پہنچائے تو اس پر عمل کرنے سے قبل خوب تحقیق کرلو تاکہ ایسا نہ ہو کہ تم جہالت میں کسی قوم کو تکلیف پہنچاؤ جس پر تمھیں بعد میں پچھتانا پڑے اور پشیمانی بعد از وقت بے کار ثابت ہو۔

2۔ رسول کریم ﷺ پر اپنی رائے ٹھونسنے سے اجتناب:

دوسری آیت میں اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی کہ رسول کریم ﷺ تم میں موجود ہیں۔ ان کی موجودگی سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنی رائے بطور مشورہ ضرور دو مگر آپ ﷺ پر اپنی رائے مسلط کرنے کی خواہش نہ رکھو۔ کیونکہ اگر اکثر باتوں میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمھاری رائے مان لیں تو تم مشقت اور تکلیف میں پڑ جاؤ گے۔ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے تمھارے لیے ایمان کو محبوب بنا دیا ہے اور کفر، فسق اور نافرمانی سے نفرت پیدا کر دی ہے۔ تمھارا کام رسول کریم ﷺ کی اطاعت کرنا ہے جو اللہ کی وحی کے مطابق تمھاری رہنمائی فرماتے ہیں۔

3۔ خانہ جنگی کی صورت میں فریقین کے درمیان صلح کرانے اور انصاف کرنے کا حکم:

چوتھی آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اگر دو فریق آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے مابین صلح کراؤ۔ ہاں اگر ایک کی واضح زیادتی ہو تو ظالم کے مقابلے میں مظلوم کا ساتھ دو یہاں تک کہ ظالم اپنے ظلم سے باز آ جائے۔ ایسی صورت میں دونوں کے درمیان انصاف کے اصولوں کو مدنظر رکھ کر پائیدار صلح کرا دو۔ ویسے بھی ہر معاملے میں انصاف سے کام لو کیونکہ انصاف کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے۔

4۔ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، بصورتِ نزاع ان میں صلح کرانے کا حکم:

پانچویں آیت میں اس بات کا اعلان کیا گیا ہے کہ روئے زمین میں جہاں بھی مسلمان بستے ہیں وہ سب آپس میں بھائی ہیں۔ اگر کسی وقت دو بھائیوں میں کوئی جھگڑا پیدا ہو جائے تو دوسرے مسلمان بھائیوں کا فرض ہے کہ ان میں صلح کرا دیں تاکہ معاشرے میں امن قائم ہو اور اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل ہو۔

5۔ تمسخر اڑانے کی ممانعت:

چھٹی آیت میں اسلامی اخوت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے مسلمانوں کو ان تمام باتوں سے روکا گیا ہے جو رشتہ اخوت کو خراب کرتی ہیں۔ اوّل ٹھٹھا کرنے اور مذاق اُڑانے سے منع کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ کوئی مرد کسی مرد سے یا کوئی عورت کسی عورت سے مذاق نہ کرے۔ ہوسکتا ہے کہ جن سے مذاق کیا جارہا ہے وہ مذاق کرنے والوں سے بہتر ہوں۔ ذلت آمیز تمسخر میں انسان اپنے دوست کھو بیٹھتا ہے اور اپنے پرائے بن جاتے ہیں اس لیے رَبّ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا۔ دوم ایک دوسرے کے عیب نکالنے اور ایک دوسرے کو

برے القاب سے پکارنے سے بھی منع کیا گیا ہے کیونکہ ان باتوں سے تعلقات خراب ہوتے ہیں اور معاشرے کا امن ختم ہو جاتا ہے۔

6۔ بدگمانی، جاسوسی اور غیبت سے اجتناب کا حکم:

ساتویں آیت میں ربّ تعالیٰ نے بعض برائیوں سے اجتناب کا حکم دیا ہے۔ ان میں پہلی برائی بدگمانی ہے۔ بدگمانی بعض اوقات تو گناہ کا درجہ رکھتی ہے اس لیے بدگمانی سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ دوسری برائی جس سے اجتناب کا حکم دیا گیا ہے کسی کے عیب تلاش کرنا اور اس کے خفیہ حالات کو جاننے کی کوشش کرنا اور جاسوسی کرنا ہے۔ اس سے بھی ربّ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے کیونکہ معاشرے میں ایسی حرکات تلخی پیدا کرتی ہیں۔

تیسری برائی جس سے روکا گیا ہے وہ غیبت کرنا ہے۔ غیبت سے مراد کسی کے متعلق پیٹھ پیچھے ایسی بات کرنا جس کو سن کر وہ ناراض ہو۔ خواہ وہ بات درست کیوں نہ ہو کیونکہ اگر پس پشت غلط بات کسی کے ساتھ منسوب کی جائے تو یہ غیبت نہیں بلکہ بہتان ہے۔ اسلام کسی کے بارے میں ایسی بات پس پشت کہنے کی اجازت نہیں دیتا جس سے اس آدمی کا دل دکھے۔

7۔ مساوات نسل انسانی کا اعلان:

آٹھویں آیت میں نسل انسانی کی مساوات کا اعلان ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ خاندان اور قبیلے محض جان پہچان کی خاطر ہیں۔ عزت کا معیار صرف تقویٰ ہے نسب نہیں ہے۔ کسی کو کسی پر نسبی لحاظ سے کوئی فضیلت نہیں۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب دوم

الحدیث

احادیثِ رسول کریم ﷺ کی اہمیت اور ضرورت

قرآن مجید اللّٰہ کی آخری کتاب ہے جو اس نے اپنے آخری رسول تاجدار دو عالم ﷺ پر نازل فرمائی اور اسے قیامت تک کے لیے اسلام کا معجزہ قرار دے دیا۔ یہ کتاب فصاحت و بلاغت میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ اس کا اسلوبِ بیان اس قدر دلکش ہے کہ جو سنتا ہے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عرب جنھیں اپنی زبان دانی پر ناز تھا اس کی ایک چھوٹی سی سورت کا مقابلہ بھی نہ کر سکے۔

اس میں شک نہیں کہ کوئی ایسا امر نہیں جس کا حل قرآن مجید میں موجود نہ ہو۔ اس میں گزشتہ واقعات بھی ہیں اور آنے والے واقعات کی پیشین گوئیاں بھی، عقائد بھی ہیں اور اعمال بھی، اس میں عبادات بھی ہیں اور رہنے سہنے کے طور طریقے اور آداب بھی۔ اس میں وہ احکام بھی ہیں جنھیں ''امر'' کہتے ہیں اور وہ احکام بھی جنھیں ''نہی'' کہا جاتا ہے۔ یعنی جن باتوں کے کرنے کا حکم ہوا وہ ''امر'' کہلاتے ہیں اور جن باتوں سے روکا گیا ان کو ''نہی'' کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں ہر امر و نہی کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ ہر حکم بیان فرما دیا گیا ہے۔ نماز، روزہ، حج، خمس، زکوٰۃ، جہاد اور دوسرے فرائض کے احکام موجود ہیں لیکن جب تک ان کی تفصیل بیان نہ کی جائے تو ان پر عمل نہیں ہو سکتا۔ عبادات میں نماز کو ہر عبادت سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور قرآن مجید میں بار بار اس کا حکم دے کر تاکید فرمائی گئی ہے۔ مگر یہ کہ نماز پڑھنے کا کیا طریقہ ہے؟ اس کے ارکان کیا ہیں؟ واجبات کیا ہیں؟ سنتیں کیا ہیں؟ کتنی نمازیں فرض اور کتنی سنت ہیں، کس کس موقع پر کون کون سا کلام پڑھا جائے؟ ارکان کی ترتیب کیا ہے؟ نماز کس کلام سے شروع ہوتی ہے اور کس کلام پر ختم ہوتی ہے؟ کس وقت آواز سے پڑھی جائے اور کس وقت آہستہ پڑھی جائے؟ اس کی تفصیل سمجھانے کے لیے اللّٰہ کی طرف سے معلّم کی ضرورت ہے اور وہ معلّم رسول کریم ﷺ ہیں۔

حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي اس طرح نماز پڑھو جیسے مجھے نماز پڑھتا دیکھو، ہم جس طریقے سے فریضہ نماز ادا کرتے ہیں یہ آنحضرت ﷺ کی قولی اور عملی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ زکوٰۃ اور خمس کا حکم قرآن مجید میں موجود ہے مگر یہ کہ کس کس چیز سے، کس وقت اور کس قدر زکوٰۃ دی جائے اور خمس نکالا جائے؟ اس کی تفصیل آنحضرت ﷺ نے سمجھائی ہے۔ حج بیت اللّٰہ اور اس کے مناسک کا حکم قرآن مجید میں موجود ہے مگر ان مناسک کے ادا کرنے کا طریقہ، ادا کرنے کے اوقات اور ترتیب آنحضرت ﷺ نے سمجھائی ہے۔ روزے کا حکم دیا گیا ہے مگر یہ کہ اس میں کن کن چیزوں سے بچنا لازم ہے؟ اس کی شرائط کیا ہیں؟ یہ سب حضور ﷺ نے تعلیم فرمائے ہیں۔ جہاد فی سبیل اللّٰہ قرآن مجید کا خاص عنوان ہے۔ مگر جہاد کی تمام تفصیلات کی آپ ﷺ نے اپنی عملی زندگی سے وضاحت فرمائی ہے۔

اسی طرح معاملات اور اخلاقیات کے سلسلے میں قرآن کریم میں رہنما اصول بیان ہوئے ہیں اور ان کی تفصیلات رسول کریم ﷺ نے ذکر کی ہیں۔

قرآن کریم کی کئی آیات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ رسول کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف آیاتِ قرآنی پڑھ کر سنانے کے لیے مبعوث نہیں ہوئے تھے' بلکہ اس کے ساتھ ساتھ کتاب اللہ کی تعلیم' تشریح' اس کے اسرار و رموز کو کھولنا اور اس کے احکام کی تفصیلات بیان کرنا بھی آپ ﷺ کے مقاصدِ بعثت میں شامل تھا۔ سورہ آل عمران میں ہے۔

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (آل عمران3:124)

ترجمہ''وہ (رسول) انھیں اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

اللہ کے اس فرمان کے مطابق آپ ﷺ نے کتاب اللہ کی تشریح کی اور تفصیلات سے آگاہ فرمایا۔ اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا اور فرمایا:۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ج (النساء4:80)

ترجمہ''جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''

اور جہاں اپنی مخالفت اور نافرمانی سے منع کیا وہاں اپنے رسول ﷺ کی نافرمانی سے بھی منع فرمایا اور صاف حکم دے دیا کہ آپ ﷺ جس چیز کا حکم دیں اس پر عمل کرو اور جس سے روکیں رُک جاؤ۔

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ط وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ج (الحشر 7:59)

ترجمہ''اور جو کچھ تمھیں رسول دیں اسے لے لو یعنی جو حکم دیں اس پر عمل کرو اور جس چیز سے روکیں اس چیز سے رک جاؤ۔''

گویا مسلمانوں کو آنحضرت ﷺ کے اسوہ حسنہ کے اپنانے کی تلقین فرمائی اور آپ ﷺ کی نافرمانی کو کھلی گمراہی قرار دے دیا۔

اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت' آپ ﷺ کے اُسوہ حسنہ کی پیروی اور آپ ﷺ کے احکام پر عمل اس وقت ممکن ہے جب آپ ﷺ کے ارشادات کو مشعل راہ بنایا جائے اور احادیث کی اہمیت کو تسلیم کیا جائے۔

الاحادیث

1. رَأسُ الْحِکْمَةِ مَخَافَةُ اللّٰہِ.

ترجمہ: دانائی کی بنیاد خوفِ خدا ہے۔

لغات: رَأس: سر، بنیاد۔ حِکْمَة: موجوداتِ عالم کا علم، دانائی۔ مَخَافَة: خوف۔

تشریح: حکمت دانائی اور سمجھ کا نام ہے اور انسان اسی نعمت کے صدقے حیوانات پر فضیلت رکھتا ہے۔ اس لیے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا ط (البقرۃ:2:269)

ترجمہ: جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر عطا کی گئی۔

حکمت کا تقاضا ہے کہ ہر شے کی حقیقت معلوم کی جائے۔ اگر حکیم اور دانا انسان کائنات اور خالقِ کائنات کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرے تو وہ ضرور اس نتیجے پر پہنچے گا کہ کائنات اور اس کی ہر شے اللّٰہ کی پیدا کردہ ہے اور اللّٰہ اپنی ذات اور صفات میں لاشریک ہے۔ یوں اس حقیقت کو پالینے کے بعد اس کے دل میں اللّٰہ کی عظمت پیدا ہوگی۔ اسے اللّٰہ کی نافرمانی سے خوف آئے گا اور وہ متقی اور پرہیزگار بن کر زندگی گزارے گا۔

آپ ﷺ نے اپنی اس حدیث میں خوفِ خدا کو دانائی کی بنیاد قرار دیا ہے اور امت کو بتادیا ہے کہ اصل دانا وہ ہے جو اللّٰہ کی نافرمانی سے ڈرتا ہے۔ اگر کوئی بڑے سے بڑا فلسفی ہو مگر حقیقتِ اول یعنی خدا کا منکر یا باغی ہو تو وہ دانا نہیں۔

2. اَوَّلُ مَایُحَاسَبُ بِہِ الْعَبْدُ الصَّلٰوۃُ.

ترجمہ: سب سے پہلے بندے سے جس چیز کا حساب لیا جائے گا وہ نماز ہے۔

لغات: مَا: وہ چیز۔ یُحَاسَبُ: حساب لیا جائے گا۔ عَبْد: بندہ۔ صَلٰوۃ: نماز۔

تشریح: خداوند عالم نے اپنے بندوں کی ہدایت کی خاطر احکام بھیجے ہیں۔ اور بتایا ہے کہ وہ کون سا کام کریں اور کون سا نہ کریں۔ جب انسان بالغ ہوتا ہے تو اس پر شریعت کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے لیے واجب ہے کہ خدا نے جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے وہ انجام دے اور جن سے روکا ہے ان سے رک جائے۔ اس نے نیک کام کرنے والوں کو انعام دینے کے لیے ''جنت'' اور نافرمانی کرنے والوں کو سزا دینے کے لیے ''جہنم'' پیدا کیے ہیں لیکن جزا و سزا کا فیصلہ قیامت کے دن حساب کے بعد ہوگا۔

حقوق دو قسم کے ہیں۔

1۔ حقوق اللّٰہ، جن کا تعلق صرف خدا سے ہے۔

2۔ حقوق النّاس، جن کا تعلق لوگوں کے حقوق سے ہے۔

جن احکام کا تعلق ذاتِ خداوندی سے ہے انھیں ''عبادات'' کہتے ہیں۔ عبادات میں سب سے پہلے جس عبادت کا حساب لیا جائے گا

وہ نماز ہے کیونکہ ذکرِ خدا کی بہترین شکل نماز ہے۔نماز دین کا ستون اور مومن کی معراج ہے۔ ہر عبادت مشقت سے ادا ہوتی ہے یا اس میں مال صرف ہوتا ہے مگر نماز ایسی عبادت ہے جو بغیر کسی مشقت یا خرچ کے ادا ہو جاتی ہے اس لیے ہر امیر' غریب' بیمار' تندرست' بالغ عاقل پر ہر حالت میں فرض ہے اور بالغ ہونے سے لے کر مرتے دم تک کسی وقت معاف نہیں ہے۔ نماز خدا کی بندگی کا اقرار' اسلام کی نشانی اور اتحاد کا بہترین سبق ہے اس لیے روزِ قیامت سب سے پہلے عبادات میں سے اسی کے بارے میں حساب لیا جائے گا۔

3. اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ.

ترجمہ: روزہ میرے لیے ہے اور میں خود اس کی جزا دوں گا۔

لغات: صَوْم: روزہ۔ اَنَا: میں۔ اَجْزِیْ: میں جزا دوں گا۔

تشریح: لغتِ عرب میں ''صوم کا معنیٰ'' باز رہنے اور رک جانے کے ہیں۔

اسلام میں روزہ اسے کہتے ہیں کہ کھانے پینے اور جنسی تعلقات سے طلوعِ فجر سے رات شروع ہونے تک پرہیز کیا جائے۔ حلال غذاؤں کا کھانا پینا یا اپنی زوجہ سے جنسی تعلق حرام نہیں مگر روزہ کی حالت میں پابند کر دیا گیا ہے کہ ان جائز چیزوں سے بھی پرہیز کیا جائے تا کہ روزہ دار کے دل میں ایک قسم کی بے نیازی پیدا ہو جائے یعنی کھانا' پانی موجود ہوتے ہوئے ان سے مستغنی اور بے نیاز رہے۔

جو شخص خدائے قدوس کے حکم کی تعمیل میں ان چیزوں کو ترک کر دیتا ہے جو حلال ہیں تو وہ حرام چیزوں اور برے کاموں کی طرف جانے کی کب جرأت کر سکتا ہے۔

حرام' ناجائز اور برے کاموں سے بچنے کا بہترین درس روزہ میں ملتا ہے۔ روزہ دار ہر قسم کی کثافتوں سے دور رہتا ہے۔ صرف کھانے پینے سے نہیں بلکہ ہر قسم کی ناپاک خواہشوں' گالی گلوچ' غیبت' جھوٹ' فریب' بغض و حسد اور ظلم و بے رحمی سے پرہیز کرتا ہے۔ روزہ سے اخلاق کی حفاظت' روح کی پاکیزگی اور نفس کی تربیت ہوتی ہے۔ ہر عبادت میں ریاکاری اور نمائش ہو سکتی ہے۔ مگر روزہ صرف روزہ دار اور خدا کے درمیان ایک عہد ہے جسے روزہ دار دل سے پورا کرتا ہے۔ اسے روزہ دار اور خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اس لیے روزے کے متعلق یہ کہنا درست ہے کہ روزہ صرف خدا کے لیے رکھا جاتا ہے اور اس کی جزا دینے والا وہی ہے۔

4. اِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشَقِّ تَمْرَۃٍ.

ترجمہ: ''آگ سے بچو اگرچہ کھجور کا (کسی ضرورت مند) کو کچھ حصہ دے کر ہی سہی۔''

لغات: اِتَّقُوْا: بچو' پرہیز کرو۔ نَارٌ: آگ' مراد آتش دوزخ۔ شَقٌّ: ٹکڑا' حصہ۔ تَمْرَۃٌ: کھجور۔

تشریح: اس حدیث میں رسول کریم ﷺ نے اہلِ اسلام کو صدقے کے ذریعے دوزخ کی آگ سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے۔ دوزخ کی آگ سے جو خوفناکی میں اپنی مثال آپ ہوگی بچنے کی ہر مسلمان کو کوشش کرنی چاہیے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک کوئی بڑی نیکی نہ کی جائے دوزخ سے نجات پانا مشکل ہے۔ آپ ﷺ نے اس حدیث کے ذریعے تعلیم دی ہے کہ کسی نیکی کو حقیر نہ سمجھو اور دوزخ کی آگ سے بچنے کی کوشش کرو خواہ کسی ضرورت مند کو کھجور کا ٹکڑا دے کر ہی نیکی کا موقع مل جائے تو اسے حقیر سمجھ کر چھوڑ نہ دو۔ ایک اور مقام پر آپ ﷺ نے فرمایا۔

لَا تَحۡتَقِرَنَّ مِنَ الۡمَعۡرُوۡفِ شَیۡأً وَلَوۡاَنۡ تَلۡقٰی اَخَاکَ بِوَجۡہٍ طَلِقٍ.

''کوئی نیکی حقیر نہ جان خواہ اپنے بھائی کو کھلے چہرے سے ملنا ہی کیوں نہ ہو۔''

ایک مرتبہ جنگ کے موقع پر آپ ﷺ نے مال جمع کرنے کا اعلان فرمایا۔صحابہ کرامؓ اپنی اپنی طاقت کے مطابق مال پیش کرتے رہے۔ایک صحابیؓ کے پاس کچھ نہ تھا اس نے ایک یہودی کے ہاں جا کر سارا دن مزدوری کی اور اس کے بدلے کچھ کھجوریں حاصل کیں اور انھیں حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں لا کر پیش کر دیا۔آپ ﷺ نے فرمایا: انھیں اس ڈھیر کے اوپر ڈال دو۔جس نیت اور جذبے سے یہ کھجوریں لائی گئی ہیں وہ قابل قدر ہے۔

5. اَلۡمَاھِرُ بِالۡقُرۡاٰنِ مَعَ السَّفَرَۃِ الۡکِرَامِ الۡبَرَرَۃِ.

ترجمہ: قرآن مجید میں مہارت رکھنے والا صاحبِ عزت' نیک لکھنے والوں کے ساتھ ہے۔

لغات: مَاھِر: مہارت رکھنے والا۔ سَفَرَۃ: ''سافر'' کی جمع ہے لکھنے والے۔

کِرَامٌ: ''کریم'' کی جمع ہے' بزرگ اور معزز۔ بَرَرَۃ: بارّ کی جمع ہے۔نیکوکار۔

السفرۃ الکرام البررۃ ترجمہ: بزرگ نیکوکار لکھنے والے

یہ الفاظ ''سورۂ عَبَس ''میں فرشتوں کی تعریف میں آئے ہیں اور ''سورہ انفطار ''میں انھی فرشتوں کو ''کراماً کاتبین'' فرمایا گیا ہے یعنی بزرگ لکھنے والے۔

تشریح: خداوند عالم نے ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے مقرر فرمائے ہیں۔ایک فرشتہ اس کی نیکیاں اور دوسرا اس کے گناہ لکھتا ہے۔انسان ایک ذرہ کے برابر بھی جو عمل کرتا ہے وہ ضرور لکھا جاتا ہے۔ان سے انسان کا کوئی عمل پوشیدہ نہیں' وہ امانتدار اور دیانت دار ہیں کبھی غلطی نہیں کرتے۔

قرآن مجید میں مہارت رکھنے والوں یعنی عالموں کو ان فرشتوں کا ساتھی کہا گیا ہے یعنی ماہر قرآن ان فرشتوں کی طرح نیک' دیانت دار اور قابلِ عزت ہے۔قرآن مجید پڑھنے اور پڑھانے کا بہت ثواب ہے۔حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے ''کہ تم میں سب سے اچھا وہ شخص ہے جو قرآن سیکھے اور دوسرے لوگوں کو سکھائے''۔یہ بھی فرمایا ہے ''قرآن مجید پڑھا کرو کیونکہ وہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کی سفارش کرے گا''۔یہ بھی فرمایا ہے کہ ''جو قرآن رکھا رہے اور گھر والے اسے نہ پڑھیں وہ قیامت کے دن ان کی شکایت کرے گا۔''

اللّٰہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ ''ہم نے جن کو کتاب (قرآن مجید) دی ہے۔وہ اس کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں۔ درحقیقت وہی اس پر ایمان رکھنے والے ہیں۔حضور نبی کریم ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ جس نے قرآن بالکل نہیں سنا وہ اجاڑ گھر کی مانند ہے۔یہ بھی فرمایا ہے کہ ''جس نے قرآن مجید کا ایک حرف پڑھا اس نے ایک نیکی کی اور ایک نیکی کا اجر دس نیکیوں کے برابر ملے گا۔یہ ثواب تو ان کے لیے ہے جو قرآن مجید کی صرف تلاوت کرتے ہیں اور ماہرِ قرآن وہ ہیں جو قرآن مجید کے معنی اور مطلب کو سمجھتے ہیں اور اس کی آیات میں غور وفکر کر کے ان مقاصد کو سمجھ لیتے ہیں جن کے لیے یہ کتاب نازل کی گئی ہے۔اس لیے حضور اکرم ﷺ نے اپنی اس حدیث میں ماہرینِ قرآن کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔

6. ایَةُ الْمُنَافِقِ ثَلاثٌ وَاِنْ صَامَ اَوْصَلّٰی وَزَعَمَ اَنَّهٗ مُسْلِمٌ اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ، وَاِذَا حَدَّثَ کَذَبَ، وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ.

ترجمہ: منافق کی تین نشانیاں ہیں اگر چہ وہ روزہ رکھتا ہو' نماز پڑھتا ہو اور یہ گمان کرتا ہو کہ وہ مسلمان ہے ایک یہ کہ جب اسے امانت دی جائے تو خیانت کرے' دوسرے یہ کہ جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے' تیسرے یہ کہ جب وہ وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے۔''

لغات: ایَة: نشانی (جمع آیات)۔

ثَلاثٌ: تین۔	زَعَمَ: گمان کیا۔	اُوْتُمِنَ: امانت دیا گیا۔	خَانَ: خیانت کی۔
حَدَّثَ: بات کی۔	کَذَبَ: جھوٹ بولا۔	وَعَدَ: وعدہ کیا۔	اَخْلَفَ: وعدہ خلافی کی۔

تشریح: سچائی' ایفائے عہد اور امانت داری اسلام کی بنیادی صفات ہیں۔ جھوٹ' وعدہ خلافی اور کسی کے مال میں خیانت کرنا بجائے خود بہت بڑے گناہ ہیں۔ ایک مسلمان کے شایانِ شان نہیں کہ وہ جھوٹ بولے یا وعدہ خلافی کرے یا امانت میں خیانت کرے۔

جھوٹ گناہوں کی جڑ ہے' جھوٹ بولنے والا ہر گناہ کر لیتا ہے اور کسی گناہ کا اقرار نہیں کرتا۔ جو شخص جھوٹ سے پرہیز کرے وہ ایک نہ ایک دن ہر گناہ سے پرہیز کر لیتا ہے۔ وعدہ خلافی اور خیانت یہ دونوں جرم حقوق النّاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب حقوق النّاس کا لحاظ نہ رکھا جائے تو معاشرہ درست نہیں رہ سکتا اور نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے جھوٹ' خیانت اور وعدہ خلافی کو منافق کی علامات قرار دے کر مسلمانوں کو ان سے بچنے کی تلقین کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ یہ صفتیں منافقوں کی ہیں جو کافروں سے بدتر ہیں اور جو دوزخ کے خطرناک حصے میں اپنے اعمال کی سزا بھگتیں گے۔

اگر کسی مومن میں ان میں سے کوئی صفت پائی جائے جس نے دل سے اسلام قبول کر کے خدا سے یہ وعدہ کیا ہے کہ تمام گناہوں سے پرہیز کرے گا مگر وہ پرہیز نہیں کرتا تو اس کے قول اور عمل میں منافق کی طرح تضاد ہے۔ اس لیے اگر وہ عقیدے کے لحاظ سے منافق نہ بھی ہو مگر عمل کے لحاظ سے منافق ضرور ہے۔ کم از کم وہ ایسے جرم کا مرتکب ہے جسے ایک منافق ہی کر سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ منافقوں جیسے کام کرنا کتنا بڑا جرم ہے۔

7. اِنَّ اَکْمَلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا.

ترجمہ: یقیناً مومنوں میں بلحاظِ ایمان زیادہ کامل وہ ہے جو اخلاق میں ان سے بہتر ہو۔

لغات: اَکْمَلُ: سب سے زیادہ کامل۔ اَحْسَنُ: سب سے بہتر۔ خُلُق: عادت۔

تشریح: ایمان لغت میں یقین کرنے کو کہتے ہیں۔ اصطلاحِ شریعت میں خدا اور رسول اور آپؐ کی بتائی ہوئی ہر بات پر یقین رکھنا اور دل سے تسلیم کرنا ایمان کہلاتا ہے۔ مومن وہ ہے جو حضور ﷺ کے لائے ہوئے دین پر دل سے ایمان لائے اور زبان سے اقرار کرے۔

ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان جسے مانتا ہے اور جس کی صداقت کا زبان سے اقرار کرتا ہے اس پر عمل بھی کرے۔ اخلاقیات کے سلسلے میں اسلام نے جس قدر زور دیا ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔ اگر ایک مومن اخلاقی لحاظ سے بلند نہیں تو اس کا ایمان کس کام کا۔ مومن کہلانا اس بات کی

دلیل ہے کہ وہ اخلاقِ حسنہ سے آراستہ ہوگا۔ اسلام اعتقادات وعبادات کے ساتھ ساتھ اخلاقِ حسنہ کو پوری اہمیت دیتا ہے کیونکہ اعتقادات وعبادات کا تعلق تو زیادہ تر حقوق اللہ سے ہے مگر اخلاقِ حسنہ کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کے فرمان کے مطابق سب سے زیادہ کامل ایمان والا وہ ہے جس کا خُلق سب سے بہتر ہو جس کے اعمال واطوار اللہ کے حکم کے مطابق ہوں جو ہر وقت سیرتِ رسول کو پیشِ نظر رکھتا ہو اور اخلاقِ حسنہ میں آپ ﷺ کی تقلید کرتا ہو۔ کیونکہ اخلاقِ عالیہ کا سب سے کامل نمونہ آپ ﷺ کی ذات ہے۔

8. اَلْحَيَاءُ مِنَ الْاِ يْمَانِ.

ترجمہ: حیاء ایمان سے ہے۔

لغات: حَيَاء: شرم اور گناہ سے ہچکچاہٹ۔ مِنْ: سے۔

تشریح: رسولِ خدا ﷺ فرماتے ہیں کہ حیا ایمان سے ہے۔ حیاء اس قلبی کیفیت کا نام ہے جس کی وجہ سے انسان ناپسندیدہ کاموں سے اجتناب کرتا ہے۔ جس میں حیا ہوتی ہے وہ نہ کھلم کھلا خدا کی نافرمانی کرتا ہے اور نہ رسول کی۔ نہ کسی کا حق غصب کرتا ہے اور نہ کسی کو آزار پہنچاتا ہے۔ نہ جھوٹ بولتا ہے نہ کسی پر تہمت لگاتا ہے، نہ گالی گلوچ کرتا ہے، نہ بلاوجہ کسی کی توہین کرتا ہے نہ کسی سے بغض وحسد رکھتا ہے بلکہ خدا کے احکام پر عمل اور بندوں کے حقوق ادا کرتے رہنا اپنا فرض سمجھتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ خدا اس سے ناراض نہ ہو۔ اس لیے ایسے کاموں سے پرہیز کرتا ہے جس سے خدا ناراض ہوتا ہے اور وہ کام بڑھ چڑھ کر انجام دیتا ہے جس سے وہ راضی ہوتا ہے۔

9. مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَّبْسُطَ اللّٰهُ رِزْقَهٗ وَاَنْ يُّنَسَّاَلَهٗ مِنْ اَثَرِهٖ فَلْيَصِلْ رَحِمَهٗ.

ترجمہ: جسے پسند ہو کہ اللہ اس کی روزی فراخ کرے اور اس کی عمر دراز ہو تو اسے چاہیے کہ وہ رشتہ داروں سے تعلقات قائم رکھے۔

لغات: مَنْ سَرَّهٗ: جسے پسند ہو۔ يَبْسُطُ: وسیع کردے۔ يُنَسَّاءُ: باقی رکھا جائے۔ اثر: نشان (زندگی)۔

تشریح: ہر انسان دل سے چاہتا ہے کہ اس کی روزی فراخ ہو اور اس کی زندگی میں برکت ہو۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جسے یہ خواہش ہو اسے چاہیے کہ اپنے قریبی رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرے۔ ''رحم'' محاورہ میں قریبی رشتہ داروں کے لیے بولا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کا مرکز جہاں سب مل جاتے ہیں ایک ہی ہوتا ہے۔ اس لیے قریبی رشتہ دار امیر ہوں یا غریب' انسان کا فرض ہے کہ ان سے اچھے تعلقات رکھے اور ان کے حقوق ادا کرنے میں سستی نہ کرے۔ اگر وہ مال ودولت یا کسی وجہ سے بڑا آدمی بن جائے تو بھی ان سے قطع تعلق نہ کرے۔ جس قدر ہو سکے ان پر احسان کرتا رہے بلکہ جو رشتہ دار اس سے دور رہنا چاہیں انھیں بھی ملانے کی کوشش کرے۔ خداوندِ عالم اس کی روزی میں فراخی عطا کرے گا اور اس کی عمر میں برکت دے گا۔ جن کے ساتھ وہ اچھا سلوک رکھتا تھا اور ان پر احسان کرتا تھا وہ اسے یاد کر کے دُعائیں دیں گے۔

صلہ رحم کا مطلب یہ ہے کہ رشتہ دار کی جو جائز ضرورت ہو اسے پورا کرنے کی حتی المقدور کوشش کی جائے۔ بھوکا ہو تو اس کا پیٹ بھرنا، مقروض ہو تو اس کا قرض ادا کرنا اور اسے ہر طرح خوش رکھنا صلہ رحمی کہلاتا ہے۔

10. اِنَّ الدَّالَّ عَلَى الْخَيْرِ كَفَا عِلِهٖ.

ترجمہ: نیک راہ دکھانے والے کا ثواب اس قدر ہے جس قدر نیکی کرنے والے کا ثواب ہے۔

لغات: دَالٌّ: راہ دکھانے والا۔ خَیْرٌ: نیکی۔ فَاعِلٌ: کرنے والا۔

تشریح: سورہ یٰسٓ میں ہے۔ نَکْتُبُ مَاقَدَّمُوْا وَاٰثَارَھُمْ ط [12:36]

ترجمہ ''ہم ہر ایک کے نام پر اس کے عمل بھی لکھتے ہیں اور اس کے اثر بھی۔'' کسی کے عمل خیر کو دیکھ کر جو شخص کوئی اچھا عمل سیکھ لے اور عمل کرنے لگے وہ بھی اس کا اثر ہے۔ چہ جائیکہ وہ شخص جو لوگوں کو دینِ حق کی ہدایت کرے، ان کو صحیح راستہ بتائے اور ان کی رہنمائی کرے جس کی وجہ سے سینکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمی راہِ حق پر چل پڑیں اور چراغ سے چراغ جلتے چلے جائیں' دین اسلام شرق و غرب میں پھیل جائے اور چار دانگ عالم میں اسلام کا ڈنکہ بجنے لگے تو یہ سب اس شخص کی رہنمائی اور تبلیغ کا نتیجہ ہوگا۔ جس نے اچھے کاموں کی ہدایت کی ہے۔ اس لیے جس قدر لوگ اس کی رہنمائی سے اثر لے کر جو جو عمل کریں گے اور جس قدر ثواب کے مستحق قرار پائیں گے اسی قدر ثواب اس شخص کو بھی ملے گا جس نے رہنمائی کی ہے۔

11. خَیْرُ النَّاسِ مَنْ اَنْفَعُھُمْ لِلنَّاسِ.

ترجمہ: بہترین انسان وہ ہے جو سب سے زیادہ لوگوں کو نفع پہنچائے۔

لغات: اَنْفَعُ: سب سے زیادہ نفع پہنچانے والا۔ اَلنَّاسِ: انسان۔لوگ۔

تشریح: ہر انسان اپنے نفع کی فکر میں رہتا ہے۔ اپنا فائدہ تلاش کرتا ہے اور اسی فکر میں زندگی گزار دیتا ہے۔ چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ کمائے اور زیادہ سے زیادہ اپنی ذات کو آرام پہنچائے مگر یہ صفت تو جانوروں میں بھی پائی جاتی ہے۔ بے عقل حیوان بھی اپنی روزی' اپنی ضروریات پوری کرنے کی فکر میں ہر وقت رہتے ہیں۔ بس فرق صرف یہ ہے کہ وہ حلال و حرام اور اپنے پرائے مال میں امتیاز نہیں کرتے۔

صحیح معنوں میں انسان کہلانے کے قابل وہ ہے جو دوسروں کو نفع پہنچائے، دوسروں کے کام آئے، دوسروں کے دُکھ درد میں شریک ہو اور انھیں خوش رکھنے کی کوشش کرے۔

لہٰذا مسلمان جس قدر مخلوقِ خدا کی مدد کرتا جائے گا اسی قدر اس کی انسانیت کا درجہ بلند ہوتا جائے گا اور جو سب سے زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچائے وہ سب انسانوں سے بہتر ہے۔

12. اِنَّ مِنْ اِجْلاَلِ اللّٰهِ اِکْرَامَ ذِی الشَّیْبَةِ الْمُسْلِمِ.

ترجمہ: بوڑھے مسلمان کا احترام کرنا خدا کے جلیل ہونے کا اعتراف کرنا ہے۔

لغات: اِجْلَال: بڑا سمجھنا' جلیل ہونے کا اقرار کرنا۔ اِکْرَام: احترام کرنا۔ ذِی الشَّیْبَةِ: بڑھاپے والا' بوڑھا۔

تشریح: اسلام عمر میں بڑے لوگوں کے احترام کا حکم دیتا ہے اور جو لوگ بڑھاپے کو پہنچ جائیں اور ان کے بالوں میں سفیدی آ جائے تو وہ اور زیادہ احترام کے مستحق قرار دیئے گئے ہیں۔ اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے بوڑھے مسلمان کے احترام کو اللّٰہ تعالیٰ کی بزرگی کے اعتراف کا حصہ قرار دیا ہے گویا جو شخص کسی بوڑھے مسلمان کی عزت کرتا ہے وہ اپنے دل میں اللّٰہ کی عظمت و کبریائی پر پورا ایمان رکھتا ہے۔ معاشرے میں اگر بزرگوں کی عزت کا خیال نہ رہے تو بے راہ روی کا دور دورہ ہوگا اور بزرگوں کے احترام اور ان کے تجرباتِ زندگی سے فائدہ

اٹھانے کا جذبہ مفقود ہو جائے گا۔ بوڑھے اس لیے احترام کے مستحق ہیں کہ وہ نوجوانوں سے عمر میں بڑے ہیں علم میں فائق ہیں اور نیک ہونے کی صورت میں عمل میں بھی ان سے آگے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی ان کا اونچا مقام ہے۔اس لیے بوڑھے مسلمان کا احترام اللہ کی بزرگی کا اعتراف ہے کیونکہ جو کسی بزرگ کی عزت کرتا ہے وہ بزرگ و برتر خدا کی عزت و تکریم میں کوئی کمی نہیں چھوڑتا۔

13. لَيْسَ مِنَّامَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا.

ترجمہ: وہ شخص ہم میں سے نہیں جس نے ہمارے چھوٹے پر رحم نہیں کھایا اور بڑے کا احترام نہیں کیا۔

لغات: لَيْسَ: نہیں۔ لَمْ يَرْحَمْ: رحم نہیں کھایا۔ لَمْ يُوَقِّرْ: احترام نہیں کیا۔ صَغِيْر: چھوٹا۔ كَبِيْر: بڑا۔

تشریح: اس حدیث میں آدابِ معاشرت کا ایک زرّیں اصول سمجھایا گیا ہے کہ بڑوں کی عزت کی جائے اور چھوٹوں پر رحم کھایا جائے۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے اس فرمان کے ذریعے اس شخص کو اپنی امت سے خارج قرار دیا ہے جو بڑوں کی عزت نہیں کرتا اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے پیش نہیں آتا۔

آنحضور ﷺ سے بڑھ کر کائنات میں اور کون ہے؟ آپ ﷺ کی مجلس میں جب کسی قوم کا کوئی سردار آتا تھا تو آپ ﷺ اس کی عزت کرتے اور اسے اس کے مقام کے مطابق جگہ عطا فرماتے۔

اسی طرح آپ ﷺ کی بچوں کے ساتھ شفقت بھی مثالی تھی۔ آپ ﷺ بچوں سے بہت زیادہ پیار کرتے تھے۔ مختلف احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ بچوں کو گود میں اُٹھا لیتے' انھیں بوسہ دیتے' سواری کے وقت اپنے پیچھے بٹھا لیتے۔ اگر گلی میں سے گزرتے وقت بچے آپ ﷺ کے دامن سے لپٹ جاتے تو آپ ﷺ کھڑے ہو جاتے اور ان سے پیار کرتے۔

حضور ﷺ کی اس حدیث کی روشنی میں ہمارے بوڑھوں اور نوجوانوں کو اپنے کردار کا جائزہ لینا چاہیے۔

14. مَنْ لَّمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ.

ترجمہ: جس شخص نے لوگوں کا شکر ادا نہ کیا اس نے خدا کا شکر نہیں کیا۔

لغات: لَمْ يَشْكُرْ: اس نے شکر نہ کیا۔

تشریح: شُکرِ منعم یعنی ہر احسان کرنے والے کا شکریہ ادا کرنا فرض ہے۔ اس سے احسان کرنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اچھا کام کیا۔ اس لیے اسے سراہا جا رہا ہے۔ یوں اس کے دل میں احسان کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور بھلائی اور امداد کرنے کو دل چاہتا ہے کیونکہ قدر دانی اور پسندیدگی سے ہمت افزائی ہوتی ہے۔ معاشرے میں اچھے لوگوں کی عزت افزائی سے اچھائی کا جذبہ بڑھتا رہتا ہے۔ شکر ادا کرنے سے جس پر احسان کیا گیا تھا اس کا عجز و انکسار ظاہر ہوتا ہے۔ تواضع اور انکسار خود ایک اچھی صفت ہے جو انکسار کرے تکبر اس کے قریب نہیں آ سکتا۔ اس لیے خدا یہی چاہتا ہے کہ ہم ہر احسان کرنے والے کا شکریہ ادا کرنے کے عادی ہو جائیں تاکہ انسانیت کے رشتے استوار ہوں اور امداد باہمی عام ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کو جس کسی سے جو فائدہ پہنچتا ہے وہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے مگر اس دُنیا میں ہر شے کے لیے اسباب بنا

دیئے گئے ہیں۔ اگر کسی شخص کی طرف سے کسی کے ساتھ کوئی نیکی یا احسان ہو تو اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے محسن کا شکریہ ادا کرے جو انسانوں کے احسانات پر شکر ادا نہیں کرتے وہ اللہ کریم کا شکر کب ادا کریں گے۔ اس لیے جو لوگ اپنے احسان کرنے والوں کے شکر گزار ہوتے ہیں وہ اللہ کے بھی شاکر بندے ہوتے ہیں۔ جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتے وہ عموماً اللہ کے بھی باغی ہوتے ہیں اس لیے آنحضور ﷺ نے سچ فرمایا جس نے لوگوں کا شکر ادا نہیں کیا اس نے اللہ کا شکر بھی نہیں کیا۔

15. مَنْ لَّا یَرْحَمُ لَّا یُرْحَمُ.

ترجمہ: جو شخص رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

لغات: لَا یَرْحَمُ: وہ رحم نہیں کرتا۔ لَا یُرْحَمُ: اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

تشریح: خداوند عالم نے رحم انسان کی فطرت میں رکھا ہے۔ یہ فطرت کا تقاضا ہے کہ کسی مجبور، معذور اور مظلوم کو دیکھ کر اس پر رحم آ جائے۔ اگر انسان کی فطرت میں رحم نہ ہوتا تو اپنی اولاد یا قریبی رشتہ داروں پر رحم نہ کرتا۔ مگر جس نے فطرت کو بدل دیا اور کسی مجبور پر رحم نہیں کیا تو وہ کیوں کر یہ امید کر سکتا ہے کہ جب وہ مصیبت میں مبتلا ہوگا تو اس پر رحم کیا جائے گا کیونکہ مثل مشہور ہے "جیسا کرنا ویسا بھرنا"۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ مصائب میں غیروں کے کام آتے ہیں اور کسی کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے ہیں۔ جب کبھی ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو تمام لوگ ان کے ساتھ مصیبت میں شریک ہوتے ہیں۔

جن لوگوں کے دلوں میں رحم نہیں ہوتا اور وہ کسی کی مصیبت کے وقت اپنے دل میں ہمدردی نہیں پاتے۔ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو لوگوں کے دل بھی ان کے بارے میں رحم اور ہمدردی سے خالی ہوتے ہیں۔ اس حدیث میں حضور ﷺ نے فطرت کا اصول بیان فرمایا کہ جس کے دل میں دوسروں کے لیے رحم موجود نہیں اسے یاد رکھنا چاہیے کہ وہ بھی دوسروں کی ہمدردیوں سے محروم رہے گا۔

16. مَا اٰمَنَ بِیْ مَنْ بَاتَ شَبْعَانَ وَجَارُهٗ جَائِعٌ.

ترجمہ: وہ شخص مجھ پر ایمان نہیں لایا جس نے سیر ہو کر رات گزاری اور اس کا ہمسایہ بھوکا رہا۔

لغات: آمَنَ: ایمان لایا۔ بَاتَ: رات گزاری، شَبْعَان: سیر ہو جانے والا۔ جَارٌ: پڑوسی، ہمسایہ۔ جَائِعٌ: بھوکا۔

تشریح: جو شخص خود سیر ہو کر کھالے اور رات کو سو جائے مگر اس کا ہمسایہ بھوکا ہو تو وہ سچا مسلمان نہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے ایسے شخص کو مومن کامل قرار نہیں دیا جسے اپنے ہمسائے کی تکلیف اور تنگی کا احساس نہ ہو۔ خود سیر ہو کر کھا لینا جبکہ ہمسایہ بھوکا ہو، مومن کی شان کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دُنیا میں آزمائش کی خاطر بعض انسانوں کے رزق میں فراخی عطا فرمائی ہے اور بعض کے رزق کو تنگ کر دیا ہے۔ دولت مندوں کے ہاں وسیع رزق اللہ کی امانت ہے، جس میں غربا اور مساکین کا حق ہے۔ اگر دولت مند حضرات اپنے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کا خیال رکھیں اور ان کی امداد کر کے ان کی تکالیف دور کریں تو معاشرے میں ظالمانہ تفاوت ختم ہو جائے۔ اسلام میں رشتہ داروں کے بعد پڑوسی کا حق ہے۔ حضور ﷺ نے ایک بار فرمایا کہ جبریل علیہ السلام نے مجھے ہمسائے کے حقوق ادا کرنے کے بارے میں اس قدر بار بار وصیت کی کہ مجھے خیال آنے لگا کہ شاید اللہ ہمسائے کو بھی وارث بنا دے گا اور ترکہ میں اس کا حصہ بھی مقرر ہو جائے گا۔

17. اَوۡلَی النَّاسِ مَنۡ بَدَءَ هُمۡ بِالسَّلَامِ.

ترجمہ: بہترین انسان وہ ہے جو پہلے سلام کرے۔

لغات: اَوۡلٰی: بہتر، برتر۔ بَدَءَ: ابتداء کی۔

تشریح: سلام ایک قسم کی دُعا ہے۔ سلام کرنے والا سلامتی کی دُعا کرتا ہے۔ سلامتی کی دُعا جہاں خدا کے سامنے عاجزی کا اقرار ہے وہاں اس شخص پر ایک قسم کا احسان بھی ہے جس کو سلام کیا گیا۔ اس لیے سلام کرنا سنت مگر اس کا جواب دینا واجب ہے۔

سلام کرنا ایک کارِ خیر ہے اور خداوند عالم نے قرآن مجید میں فرمایا ہے۔

فَاسۡتَبِقُوا الۡخَیۡرٰتِ ؕ (البقرة 2:148)

ترجمہ: نیک کاموں میں آگے بڑھنے کی کوشش کیا کرو۔

اس لیے جس نے پہلے سلام کرلیا اس نے عمل خیر میں سبقت حاصل کرلی۔ اس کے علاوہ جس پر سلام کیا ہے اس کے دل میں اپنی محبت پیدا کردی۔

اسلامی اخوت اور برادری کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے بھائی کی بھلائی اور بہتری چاہتا ہے۔ جو لوگ سلام کرنے میں پہل کرتے ہیں وہ حقیقت میں شریف انسان ہوتے ہیں۔ آج کل دیکھا جاتا ہے کہ اکثر لوگ نہ تو پہلے سلام کرتے ہیں اور نہ سلام کا جواب دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ تواضع اور انکسار سے خالی ہوتے ہیں اور تکبّر ان پر مسلّط ہوتا ہے۔ آنحضور ﷺ نے ان لوگوں کو اعلیٰ اور افضل قرار دیا جو سلام کرنے میں پہل کرتے ہیں۔

18. دِمَاؤُکُمۡ وَاَمۡوَالُکُمۡ عَلَیۡکُمۡ حَرَامٌ.

ترجمہ: تمھارے خون اور تمھارے مال تم پر حرام ہیں۔

لغات: دِمَاء: خون (دَمٌ کی جمع ہے)۔ اَمۡوَال: مالٌ کی جمع ہے۔

تشریح: اسلام میں نہ مسلمان کو قتل کرنا جائز ہے اور نہ مومن بھائی کا مال بغیر اجازت استعمال کرنا حلال ہے۔ قرآن مجید میں صاف اعلان ہے کہ جو شخص جان بوجھ کر مومن کو قتل کردے۔ اس کا گھر دوزخ ہے۔ اسی طرح ایک مسلمان کا مال چوری، ڈاکے اور خیانت وغیرہ کے ذریعے لینا حرام ہے۔

ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی جان کا بھی احترام کرے اور مال کا بھی بلکہ اگر کوئی شخص مسلمان بھائی کی جان یا مال کے خلاف قدم اٹھائے تو حتی الامکان اسے روکنا اور مظلوم کی مدد کرنا لازم ہے۔

آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو کئی احادیث میں ایک دوسرے کی جان اور مال کی حفاظت کا حکم دیا ہے اور کسی مسلمان کو قتل کرنے یا اس کے مال کو ضائع کرنے اور لوٹنے سے منع فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے آخری خطبہ میں جو حجۃ الوداع کے وقت میدانِ عرفات میں دیا تھا اسی حقیقت کو تمام صحابہ کے سامنے رکھا اور فرمایا۔ سن لو! تمھاری جانیں تمھارے مال اور تمھاری آبروئیں ہمیشہ کے لیے اس طرح قابلِ احترام

ہیں جس طرح یہ شہر یہ مہینہ اور یہ دن قابلِ احترام ہیں۔

19. وَاثِلَةُ الْاَسْقَعِ، قَالَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! مَاالْعَصَبِيَّةُ؟ قَالَ: "اَنْ تُعِيْنَ قَوْمَکَ عَلَى الظُّلْمِ."

ترجمہ: وَاثِلَةُ الْاَسْقَعِ نے دریافت کیا اے اللہ کے رسول! عصبیت کسے کہتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ کہ تو ظلم کرنے میں اپنی قوم کی مدد کرے۔"

لغات: وَاثِلَةُ الْاَسْقَعِؓ: صحابی کا نام ہے۔ اَلْعَصَبِيَّةُ: تعصب۔ اَنْ تُعِيْنَ: کہ تو مدد کرے۔

تشریح: اس حدیث میں سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات نے عصبیت کی تعریف بیان فرمائی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ عصبیت یا تعصب اپنی قوم، خاندان یا وطن سے محبت کرنے کا نام نہیں بلکہ اس بات کا نام ہے کہ تو ظلم میں اپنی قوم کی مدد کرے اور قوم کی محبت تجھے اس قدر اندھا کر دے کہ تو ظلم میں بھی اس کی مدد کرنا جائز سمجھے۔ ویسے اپنی قوم سے محبت کوئی بری بات نہیں بلکہ یہ تو فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہے۔ تعصب جسے برے مفہوم میں لیا جاتا ہے وہ یہی ہے کہ اپنی قوم کا برا کام بھی اچھا معلوم ہو اور دوسروں کی اچھائیاں بھی برائیاں نظر آئیں۔ ایسے تعصب سے اجتناب لازم ہے۔ اس کے مقابلے میں عدل و انصاف کا دامن پکڑنا چاہیے۔ انصاف اس بات کا متقاضی ہے کہ ظلم کی مخالفت کی جائے خواہ ظالم کوئی رشتہ دار ہو، دوست ہو ہم وطن ہو یا ہم مذہب ہو۔

20. مَنْ فَتَحَ عَلٰى نَفْسِهٖ بَابَ مَسْئَلَةٍ فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْهِ بَابَ فَقْرٍ.

ترجمہ: جس شخص نے اپنی ذات کے لیے ایک مرتبہ سوال کا دروازہ کھولا اللہ اس کے لیے فقر و احتیاج کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

لغات: فَتَحَ: اس نے کھولا۔ بَابٌ: دروازہ (جمع ابواب)۔ فَقْرٌ: تنگی، افلاس۔

تشریح: سوال کرنا اور بھیک مانگنا بہت بری بات ہے۔ قرآن مجید میں غیرت مند مسلمانوں کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ وہ شرم و آبرو کی وجہ سے لوگوں کے سامنے سوال کا ہاتھ نہیں بڑھاتے۔ سوال کرنا عزت ضائع کرتا ہے۔ خودی کو نقصان پہنچاتا ہے اور کم ہمتی پیدا کرتا ہے۔ اپنی ضروریات کو خود پورا کرنا ایسا جذبہ ہے جو آدمی کو محنت پر تیار کرتا ہے، کوشش کی راہ کھولتا ہے اور سوجھ بوجھ پیدا کرتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے اسی پر قناعت کرے۔ اپنی ضرورتوں کو اپنی حد سے آگے نہ بڑھنے دے۔ اگر حالات سے گھبرا کر ضرورتوں سے تنگ آ کر محنت اور کوشش کے بجائے سوال کرنے اور دوسروں کا دست نگر بننے کا ارادہ کر لیا اور کسی سے کچھ مانگ لیا تو شرم جاتی رہے گی۔ یوں مشکلات کا مقابلہ کرنے کی قوت کمزور ہو جائے گی اور اللہ کی امداد کا عقیدہ کمزور ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو معزز پیدا کیا ہے۔ وہ ایک ایک کے آگے ہاتھ بڑھانے لگے تو ساری عزت برباد ہو جائے گی۔ اللہ بھی اسے پسند نہیں کرتا کہ انسان غیروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرے۔ جو انسان خود اپنے آپ کو ذلیل کرتا ہے خدا بھی اس پر ذلت مسلط کر دیتا ہے اور اس کے لیے تنگی اور افلاس کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

21. اَلسَّعِيْدُ مَنْ وُعِظَ بِغَيْرِهٖ.

ترجمہ: سعادت مند وہ ہے جو دوسروں سے سبق حاصل کرے۔

لغات: سَعِیۡدٌ: نیک بخت‘ سعادت مند۔ وُعِظَ: نصیحت کیا گیا۔ یعنی جو عبرت پکڑے۔

تشریح: کائنات کا نظام کچھ اس طرح چل رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو آرام میں رکھا ہے اور کوئی تکلیف میں مبتلا ہے۔ کسی قوم پر اپنی غلطیوں کی بناء پر عذاب نازل ہو رہا ہے اور کسی پر ربّ تعالیٰ کے فضل کی بارش ہو رہی ہے۔ سعادت مند انسان وہ ہے جو دوسروں کے حالات سے نصیحت حاصل کرے۔ اگر کسی بیمار کو دیکھے تو اپنی صحت پر خدا کا شکر ادا کرے۔ اگر کسی محتاج اور معذور کو دیکھے تو اپنے اُوپر اللہ کے انعامات کو یاد کر کے شکر گزاری میں جھک جائے۔ وہ شخص کس قدر شقی اور بدبخت ہے جسے انسانوں کی تکلیف کا احساس تک نہیں ہوتا جو قوموں کی تباہی کو دیکھ کر عبرت نہیں پکڑتا۔

حضور اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق سعادت مند وہ ہے جو دوسروں کے حالات سے نصیحت حاصل کرے اور اپنے گناہوں سے توبہ کر کے اللہ کی رضا حاصل کرے۔

قرآن کریم مختلف قوموں کے عبرت انگیز حالات بیان کرنے کے بعد اکثر مقامات پر یہ فرماتا ہے۔

فَاعۡتَبِرُوۡا یٰۤاُولِی الۡاَبۡصَارِ.

ترجمہ: اے بصیرت والو! عبرت حاصل کرو۔

22. لَایَدۡخُلُ الۡجَنَّةَ مَنۡ فِیۡ قَلۡبِهٖ مِثۡقَالُ ذَرَّةٍ مِنۡ کِبۡرٍ.

ترجمہ: ”وہ شخص جنت میں نہیں داخل ہوگا‘ جس کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہو۔“

لغات: یَدۡخُلُ: وہ داخل ہوتا ہے‘ اندر آتا ہے۔ قَلۡبِ: دل۔ مِثۡقَال: ایک وزن کا نام ہے جیسے تولہ‘ ماشہ۔ کِبۡر: تکبر۔

تشریح: تکبر کا مطلب ہے دوسرے کو حقیر اور اپنے آپ کو بڑا سمجھنا۔ تکبر ہزاروں غلطیوں‘ گناہوں اور فسادوں کی جڑ ہے۔ کبریائی صرف خدا کے لیے ہے۔ کسی کو بڑائی کے دعوے کا حق نہیں۔ تکبر ہی کی بنیاد پر خدائی کے دعوے کیے جاتے رہے‘ اور اپنی حدوں سے آگے بڑھنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ انسان ایک دوسرے پر ظلم کرنے کے لیے کمر بستہ ہوتا رہا اور ظلم اور قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا۔ دوسروں کو حقیر اور اپنے آپ کو بڑا سمجھنا ہی ان تمام فسادات کی جڑ ہے۔

تکبر کی بنیاد حضرت آدم علیہ السّلام کے سجدے سے انکار کر کے شیطان نے رکھی اور قیامت تک کے لیے ملعون قرار پایا۔ قرآن مجید میں ہے:

اَبٰی وَاسۡتَکۡبَرَ ۫ وَکَانَ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ (البقرہ: 34:2)

ترجمہ: ”(شیطان نے اللہ کا حکم ماننے سے) انکار کیا اور تکبر کیا اس وجہ سے وہ کافروں میں سے ہو گیا۔“

تکبر انسان کو سرکشی سکھاتا ہے اور سرکشی سے معاشرے کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے اپنے اس فرمان کے ذریعے یہ بتایا ہے کہ جس کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہو وہ جنت میں تکبر کی سزا بھگتے بغیر داخل نہیں ہوگا۔

23. اِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ، فَإِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ.

ترجمہ "حسد سے بچتے رہو کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔"

لغات: حَسَنَات: نیکیاں (مفرد حَسَنَةٌ) نَار: آگ۔ حَطَب: لکڑی ایندھن۔

تشریح: حسد اس خواہش کا نام ہے کہ جسے ملا ہے اسے کیوں ملا۔ اگر کسی کو کچھ ملا ہے تو اس سے سلب کر لیا جائے اور مجھے مل جائے۔ حاسد جسے بھی اچھے حال میں دیکھتا ہے اس کے دل میں آگ لگ جاتی ہے۔ اسے اپنی خواہش پوری کرنے سے زیادہ دوسرے کو تباہ کرنے کی فکر ہوتی ہے۔ اس کا کام اپنی تعمیر سے زیادہ دوسروں کی تخریب ہوتی ہے۔ حسد کفر کی جڑ ہے۔ حسد کے بارے میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے:

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا. (النسا: 53:4)

"کیا یہ لوگ انسانوں سے اس بات پر حسد کرتے ہیں جو اللہ نے اپنے فضل سے انھیں عطا کیا ہے، یقیناً ہم نے آلِ ابراہیمؑ کو کتاب اور حکمت دی اور ہم نے انھیں ملکِ عظیم عطا کیا ہے۔"

حسد کرنے والا اپنی بری عادت کی وجہ سے اللہ اور رسول ﷺ سے سرکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے اور انسانیت اور نیکیوں سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ حسد خود غرضی کا نتیجہ ہے اور خود غرضی حیوانیت کا دوسرا نام ہے۔ اس لیے حاسد انسانیت سے نکل کر حیوانیت میں قدم رکھتا ہے اور اپنی نیکیوں کو ضائع کر دیتا ہے۔

24. اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يَخْذُلُهُ وَلَا يَغْتَابُهُ وَلَا يَحْزُنُهُ وَلَا يَحْرُمُهُ.

ترجمہ: مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے وہ اس پر نہ ظلم کرتا ہے نہ اسے چھوڑ دیتا ہے۔ نہ اس کی غیبت کرتا ہے نہ اسے غمگین کرتا ہے اور نہ اسے اس کے حق سے محروم کرتا ہے۔

لغات: يَظْلِمُ: ظلم کرتا ہے۔ يَخْذُلُ: چھوڑ دیتا ہے۔ يَغْتَابُ: غیبت کرتا ہے۔
يَحْزُنُ: غمگین کرتا ہے۔ يَحْرُمُ: محروم کرتا ہے۔ اَخٌ: بھائی۔

تشریح: قرآن مجید میں ہے: "انما المومنون اخوة" مومن بھائی بھائی ہیں۔ (الحجرات: 10:49)

حضور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ.

"مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔"

جب مسلمان بھائی بھائی ہیں تو ایک دوسرے پر نہ ظلم کر سکتا ہے نہ اسے چھوڑ سکتا ہے نہ غیبت کر سکتا ہے نہ ایذا پہنچا سکتا ہے کہ وہ غمگین ہو اور نہ اسے اس کے حق سے محروم کر سکتا ہے۔ جب یہ سمجھ لے کہ اس کا فائدہ میرا فائدہ ہے اور اس کا نقصان میرا نقصان ہے۔ تو پھر کبھی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اگر آج دُنیا کے سب مسلمان بھائی بھائی بن جائیں تو وہ دُنیا کی کسی طاقت کے محتاج نہ رہیں۔

اس حدیث سے یہ پتا چلتا ہے کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر کس قدر حقوق ہیں۔ ہمیں بھی آپ ﷺ کے فرمان کی روشنی میں مسلمان بھائیوں کے ساتھ اپنے تعلقات کا جائزہ لینا چاہیے۔

25. مَثَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ، اِذَا اشْتَكٰى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعٰى لَهٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهْرِ وَالْحُمّٰى.

ترجمہ: مومنوں کی مثال آپس کے لطف ومحبت اور ہمدردی میں ایسی ہے جیسے ایک جسم جب اس کے ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم بے قرار ہو کر جاگتا رہتا ہے اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

لغات: تَوَادّ: آپس میں لطف ومحبت۔ تَرَاحُمُ: ایک دوسرے پر رحم۔

تَعَاطُفُ: آپس میں میل جول۔ جَسَد: جسم۔ تَدَاعیٰ: بلایا، مبتلا ہو گیا۔

تشریح: مومنین کی مثال جسم انسانی سے دے کر آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کے اتحاد کو ایک عمدہ مثال کے ذریعے ذہن نشین کرایا ہے۔ انسان کے جسم میں بظاہر مختلف اعضاء وجوارح ہوتے ہیں۔ ہر عضو کی شکل الگ، ہر عضو کا کام الگ، مقام الگ، مگر ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہوتے ہیں کہ سب کو ملا کر ایک انسان بنتا ہے۔ اگر ایک ایک عضو کو الگ کر لیا جائے تو وہ کچھ نہیں رہتے۔ وہ اگرچہ الگ ہیں اور ان کے کام بھی الگ الگ ہیں۔ مگر ان کا حکمران ایک ہے جس کا نام ''دل'' ہے۔ اسی کے حکم سے آنکھ دیکھتی ہے، کان سنتا ہے، ناک سونگھتی ہے، منہ چکھتا ہے، زبان بولتی ہے، ہاتھ اٹھتے ہیں، پیر چلتے ہیں۔ ان میں کثرت کے باوجود ایسا اتحاد ہے کہ جب ایک عضو کو تکلیف ہو جاتی ہے تو اس کی وجہ سے سارا جسم بے قرار ہو جاتا ہے اور اس عضو کی تکلیف مریض کو سونے نہیں دیتی۔ تکلیف ایک عضو میں ہوتی ہے مگر سارے جسم میں بخار چڑھ آتا ہے۔ اس لیے کہ سب کا مرکز دل ہے اور وہی سب کا حاکم ہے اور ہر عضو اس سے وابستہ ہے۔ ممکن ہی نہیں کہ کسی عضو کو تکلیف ہو اور اس کا اثر دل پر نہ ہو اور جب جسم کا بادشاہ ''دل'' بے قرار ہو جاتا ہے تو سارا جسم بے قرار ہو جاتا ہے۔ اور ہر عضو یہ سمجھتا ہے کہ یہ مرض اسے نہیں بلکہ مجھے ہے۔ مگر اس کا سبب یہ ہے کہ یہ سب اعضا اس طرح ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں کہ کئی ہونے کے باوجود سب ایک ہو گئے ہیں۔

حضور نبی اکرم ﷺ کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح ایک جسم کے تمام اعضاء ایک دوسرے سے متصل ہیں۔ ایک دوسرے کے ہر دکھ درد میں شریک ہیں۔ ایک کی راحت دوسرے کی راحت اور ایک کی تکلیف دوسرے کی تکلیف ہے اور سب کا مرکز ایک ہے۔ اسی طرح مسلمان جن کا خدا ایک، رسول ایک، قرآن ایک، دین ایک اور قبلہ ایک ہے انھیں بھی اسی طرح مل کر رہنا چاہیے اور ایک دوسرے کے دُکھ درد، رنج اور خوشی میں شریک ہونا چاہیے جس طرح ایک جسم کے اعضا ہوتے ہیں۔

سوالات

1۔ احادیثِ رسول ﷺ کی اہمیت اور ضرورت پر مختصر نوٹ لکھئے۔

2۔ خوفِ خدا اور نماز کی اسلام میں کیا اہمیت ہے۔

3۔ صدقہ اور روزہ کے بارے میں اسلام کے کیا احکام ہیں؟

4۔ حدیث میں منافق کی کیا نشانیاں بیان ہوئی ہیں؟

5۔ اخلاق اور شرم وحیا کے بارے میں حضور ﷺ کا کیا ارشاد ہے۔

6۔ حدیث میں بوڑھوں اور بچوں کے کون سے حقوق بیان کیے گئے ہیں۔

7۔ ہمسایوں کے حقوق کے بارے میں فرمانِ رسول ﷺ بیان کریں۔

8۔ حدیث رسول ﷺ کی روشنی میں مسلمان کے مسلمان پر حقوق کی مختصراً نشاندہی کیجئے۔

9۔ مومنوں کا آپس میں کیسا سلوک ہوتا ہے؟ حدیث کی روشنی میں وضاحت کیجئے۔

10۔ حسد کی مذمت میں رسول پاک ﷺ نے کیا ارشاد فرمایا؟

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب سوم

تعلیماتِ اسلام

۱۔ توحید

تعلیماتِ اسلام میں توحید کو بنیادی اور مرکزی مقام حاصل ہے۔اس لیے سب سے پہلے اسی عنوان پر لکھا جاتا ہے۔

توحید:

توحید کا لغوی معنی ایک بنانا یا یکتا ثابت کرنا ہے اور اصطلاحی معنی کے لحاظ سے اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ہے۔یعنی اس بات کا اعتقاد رکھنا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات، صفات اور افعال کے لحاظ سے یکتا اور بے مثال ہے۔تمام کائنات صرف اسی کی مخلوق ہے اور اسی کی تدبیر کے مطابق چل رہی ہے۔کائنات میں اس کے علاوہ اور کوئی خدا نہیں جو اس کے ساتھ ذات، صفات یا افعال میں شریک ہو۔وہ تمام عیبوں سے پاک ہے اور تمام کمالات اس میں موجود ہیں۔وہ حیّ اور قیّوم ہے یعنی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔فنا ہونا اور موت کا آنا اس کے لیے محال ہے اور اس طرح وہ تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔اس کام میں اسے کسی مدد کی ضرورت نہیں، وہ اکیلا ہی قیوم ہے۔وہ صمد ہے یعنی اپنے وجود اور کام میں کسی کا محتاج نہیں۔

وہ اکیلا ہی عبادت کے لائق اور عبادت کا مستحق ہے۔کوئی اور ذات اس استحقاق میں اس کی شریک نہیں بن سکتی۔وہ اپنی ذات، صفات اور افعال میں وحدہ لاشریک ہے۔ذات میں ایک ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس جیسی ذات اور کوئی نہیں۔صفات کی وحدت سے یہ مراد ہے کہ اس جیسی صفاتِ کاملہ کسی اور ذات میں نہیں پائی جاتیں اور افعال کی وحدت کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کی تمام تدابیر صرف اسی کے ہاتھ میں ہیں اور جو کام وہ کر سکتا ہے دوسرا کوئی بھی نہیں کر سکتا اور نہ اس کے معاملات میں دخل دے سکتا ہے۔

قرآن کریم نے اس مسئلۂ توحید پر بہت زور دیا ہے اور مختلف طریقوں سے توحید کے عقیدے کو راسخ کرنے اور ہر قسم کے شرک کو ختم کرنے کی تعلیم دی ہے۔قرآن کی ایک سورت کا نام سورۂ اخلاص یا سورۂ توحید ہے جس میں وحدانیتِ باری تعالیٰ کو مکمل طور پر ثابت کیا گیا ہے۔قرآنی الفاظ ملاحظہ ہوں:

قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌۚ	کہہ دیجئے اللہ ایک ہے۔
اَللّٰهُ الصَّمَدُۚ	اللہ کسی کا محتاج نہیں۔
لَمۡ يَلِدۡ ۙ وَلَمۡ يُوۡلَدۡۙ	نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ بیٹا۔
وَلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (الاخلاص 112:1:4)	اور کوئی اس کا ہمسر اور ثانی نہیں۔

پہلی آیت میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ اللّٰہ (اپنی ذات' صفات اور افعال میں ایک ہے۔ وہ فرقے جو خدا کے ساتھ کسی اور کو ذات میں یا صفات میں یا افعال میں شریک ٹھہراتے ہیں' ان کی تردید ہوگئی جیسا کہ مجوسی' ہندو اور نصرانی ایک سے زیادہ خداؤں کے قائل ہیں۔ دوسری آیت میں اس امر کا اعلان ہوا کہ اللّٰہ اپنے وجود یا صفات یا افعال میں کسی کا محتاج نہیں۔ کائنات کا ہر معبود باطل اس صفت سے خالی ہے۔ اللّٰہ کے سوا کوئی ذات ایسی نہیں جو کسی کی محتاج نہ ہو۔ یوں صمد کہہ کر تمام معبودانِ باطل کا خاتمہ کر دیا۔

تیسری آیت میں اس بات کا اعلان ہوا کہ اللّٰہ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا۔ اس اعلان میں یہود اور نصاریٰ کی جو اس قسم کے رشتے اللّٰہ کے لیے قائم کیے ہوئے ہیں' سخت تردید ہوگئی اور ان کے عقیدے کا بُطلان ثابت ہو گیا۔

آخری آیت میں اس بات کا اعلان ہے کہ اللّٰہ ہر لحاظ سے بے مثال اور بے نظیر ہے۔ دُنیا میں کوئی بھی کسی لحاظ سے اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ قرآن کریم کی اس مختصر سی سورت نے ہر قسم کے شرک کی جڑ کاٹ دی اور عبادت کا استحقاق صرف اللّٰہ کے لیے ثابت کر دیا۔ عقل کے اندھے اب بھی اللّٰہ کے سوا غیروں کو ان صفات اور افعال میں شریک ٹھہراتے ہیں مگر عقلِ سلیم اللّٰہ کے سوا کسی اور کو معبودِ حق ماننے کے لیے تیار نہیں۔

توحید پر اسلام کا زور

توحید اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے اور اسی پر دُنیا اور آخرت کی کامیابی کا انحصار ہے۔ نبوت کے اعلان کے کچھ عرصہ بعد حضرت محمد صلی اللّٰہ علیہ واٰلہ وسلم نے مکہ معظّمہ میں صفا کی پہاڑی پر چڑھ کر اپنی قوم (قریش) کو پہلا خطبہ دیا جس میں آپؐ نے فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قُوْلُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا.

ترجمہ: اے لوگو! کہو کہ اللّٰہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں' کامیابی اور فلاح پاؤ گے۔

عقیدۂ توحید پر زور دیتے ہوئے حضور صلی اللّٰہ علیہ واٰلہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا تھا:

اِنَّ التَّوْحِيْدَ رَأْسُ الطَّاعَاتِ. ''توحید تمام نیکیوں کی جڑ ہے۔''

عقیدۂ توحید ایسا عقیدہ ہے جس کی صداقت اور سچائی پر خود اللّٰہ نے فرشتوں اور عالموں نے گواہی دی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا ۢ بِالْقِسْطِ ؕ (آل عمران 18:3)

ترجمہ: اللّٰہ نے اس بات کی گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور یہی گواہی فرشتے اور انصاف پر قائم رہنے والے عالم بھی دیتے ہیں۔ دُنیا میں جتنے پیغمبر آئے ہیں ان سب کو خُدائے واحد کی عبادت کی وحی کی گئی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (الانبیاء 25:21)

ترجمہ: اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس کی طرف یہ وحی نہ کی ہو کہ میرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں' پس میری ہی عبادت کیا کرو۔

اللّٰہ کی ذات' صفات اور عبادت میں کسی کو شریک ٹھہرانا شرک کہلاتا ہے۔ یہ کفر اور خدا کے انکار کی ایک شکل ہے۔ شرک ایک ناقابلِ

معافی جرم ہے۔اللہ تعالیٰ انسان کی سب خطاؤں اور غلطیوں کو معاف کرتا ہے لیکن جو شخص شرک کرتا ہے اسے کبھی معاف نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُاَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ط (النساء 116:4)

ترجمہ: بے شک اللہ یہ جرم نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے اور اس کے علاوہ اور گناہ جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا۔ شرک سے گندے خیالات اور ناپاک ارادے پیدا ہوتے ہیں۔اس لیے قرآن مجید میں رَبّ العزت نے مشرکوں کو نجس اور ناپاک قرار دیا ہے:

اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ (التوبہ 28:9) ''بے شک مشرک ناپاک ہیں''

جو لوگ دوسروں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں، وہ ظالم ہیں۔اللہ کا فرمان ہے:

اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (لُقمٰن 13:31) ''بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔''

اس آیت میں شرک کو ظلم عظیم کہا گیا ہے۔ظلم کسی چیز کے ناجائز استعمال کا دوسرا نام ہے۔مشرک ہمیشہ اپنے تمام اعضاء سے ان کی طبیعت اور فطرت کے خلاف کام لیتا ہے، انھیں اللہ کے سوا دوسروں کے آگے جھکاتا ہے اور ان سے خدا کی مرضی کے مطابق کام نہیں لیتا۔ اس لیے خداداد عطیات سے ناجائز کام لینے والا سب سے بڑا ظالم ہے اور اپنے محسن کے احسانات بھلا کر اس کی اطاعت سے منہ موڑنے والا اور اس کی دی ہوئی نعمتوں سے اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والا سب سے بڑا باغی ہے اس لیے مشرک کی بخشش نہیں ہوگی۔

خُدا کی ذات ہر لحاظ سے بے مثال ہے۔اس کی مملکت کی کوئی حد نہیں۔اس کی دولت بے حساب ہے اور اس کی قدرت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔جاہل، ظالم اور باغی لوگ شرک کر کے خدا کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔اپنے شرک کا نقصان سراسر مشرک کو ہی پہنچتا ہے۔مشرک چونکہ اپنی عقل سے صحیح کام نہیں لیتا اس لیے زندگی کے ہر میدان میں گمراہی اس کا حصّہ بن جاتی ہے اور وہ کائنات میں فساد اور ظلم کا داعی یا مددگار بن جاتا ہے اور یوں اپنی زندگی خود اپنے لیے جہنم بنا دیتا ہے اور آخرت بھی خراب کر بیٹھتا ہے۔

کردار سازی میں توحید کا حصّہ

انسانی سیرت کی تشکیل اور کردار سازی میں عقیدۂ توحید بڑی مدد دیتا ہے۔یہ عقیدہ انسان کی زندگی پر مندرجہ ذیل خوشگوار اثرات ڈالتا ہے:

1- عقیدۂ توحید سے انسان میں عزتِ نفس اور خودداری پیدا ہوتی ہے۔وہ تمام مخلوق سے بے نیاز ہوتا ہے۔اس کا سر اللہ کے سوا دُنیا کی کسی دوسری طاقت کے سامنے نہیں جھکتا۔

2- اللہ کو ایک ماننے والا خوددار ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت متواضع اور منکسر المزاج ہوتا ہے۔وہ کبھی اپنی قابلیت، طاقت، منصب اور مال و دولت پر غرور اور گھمنڈ نہیں کرتا۔

3- عقیدۂ توحید سے انسان کا دل مطمئن اور پُراُمید ہوتا ہے۔جو لوگ ایمان لا کر اپنے آپ کو ہر طرح کے ظلم و شرک سے بچائے رکھتے ہیں، ان کے لیے امن و سلامتی اور اطمینان کی زندگی ہوتی ہے۔

4- عقیدۂ توحید سے انسان میں صبر وقناعت، بلند ہمتی اور توکّل کی صفات پیدا ہوتی ہیں۔ وہ مشکلات سے نہیں گھبراتا۔ چونکہ اس کی کوشش کا مقصد اللہ کو خوش کرنا ہوتا ہے اس لیے وہ مشکل سے مشکل کام اور بڑی سے بڑی تکلیف سے پریشان نہیں ہوتا۔

5- توحید کا قائل صرف ایک خدا سے ڈرتا ہے، کسی دوسرے سے نہیں ڈرتا، اس لیے شجاع اور بہادر ہوتا ہے اور حق کی خاطر جان، مال اور اولاد کی قربانی سے کبھی دریغ نہیں کرتا۔

6- عقیدۂ توحید نسلِ انسانی کے درمیان مساوات اور برابری کا درس دیتا ہے۔ وہ انسان کو ذات پات اور دیگر معاشرتی اور معاشی اونچ نیچ کے بندھن سے آزاد کر دیتا ہے۔

7- کلمۂ توحید انسان کے دل میں اسلامی اخوت کا جذبہ ابھارتا ہے۔ تعصب، تنگ نظری اور گروہ بندی کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اسلام دینِ توحید ہے۔ دیگر تمام مذاہب میں بت پرستی یا شرک کو کسی نہ کسی درجے میں تسلیم کیا جاتا ہے مگر اسلام کی تعلیمات خداوند تعالیٰ کی ذات وصفات کی یکتائی کے بارے میں نہایت واضح ہیں۔ اسلام نے عقیدۂ توحید پر اِتنا زور دیا ہے اور شرک کی نامعقولیت پر ایسے واضح اور روشن دلائل قائم کیے ہیں کہ شرک اور بت پرستی کرنے والوں کو دل ہی دل میں ندامت اٹھانا پڑتی ہے اور وہ اپنے شرک میں توحید کی جھلک دکھانے کے لیے حیلے اور بہانے تراشنے لگتے ہیں۔

2 - اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس کی اہمیت

قرآن مجید کی نگاہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ادب واحترام ایمان کی جان اور انسانیت کی روح ہے۔ جس طرح عقیدۂ توحید کے ذریعے ایک اللہ پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر یقین رکھ کر آپؐ کے احکام کی اطاعت بھی فرض ہے۔

رسول کریمؐ پر ہمارا ایمان تین حیثیتوں سے ضروری ہے۔

1- آپؐ خُدا کے سچے پیغمبر ہیں۔

2- آپؐ کی ہدایت نہایت مکمل ہے۔

3- آپؐ کے بعد قیامت تک نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ ہی ایسا شخص آئے گا جس پر ایمان لانا ضروری ہو، کیونکہ آپؐ خدا کے آخری پیغمبر ہیں اور صرف آپؐ کی اطاعت ہر ایک پر فرض ہے۔ یہ اس لیے کہ آپؐ کی ذات اللہ تعالیٰ کو پہچاننے اور اس کی مرضی معلوم کرنے کا آخری ذریعہ ہے، اور آپؐ قیامت تک انسانوں کے لیے اللہ کے واحد پیغمبر ہیں۔ آپؐ کے بعد کسی نئے نبی کی ضرورت باقی نہیں رہتی، کیونکہ آپؐ نے جو پیغام (قرآن وسنت کی صورت میں) چھوڑا ہے وہ ایک تو نہایت محفوظ ہے اور دوسرے وہ نہایت مکمل ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے لیے اس میں رہنمائی موجود نہ ہو۔ تیسرے آپؐ کی رسالت کسی خاص قوم یا زمانے کے لیے نہیں بلکہ تا قیامت آنے والے انسانوں، اور قوموں کے لیے ہے۔ چوتھے آپؐ کے پیغام کو آپؐ کے بعد لوگوں تک پہنچانے کے لیے اُمت مسلمہ کے علماء کی ڈیوٹی لگائی گئی ہے تا کہ قیامت تک سلسلہ جاری رہے اور کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ میرے پاس حق پہنچانے والا کوئی نہیں آیا۔ یوں آپؐ کے بعد نبوت کے جاری رکھنے کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ آپؐ کو اللہ کی طرف سے جو پیغام کتاب وسُنت کی شکل میں

ملاوہ زندہ، محفوظ، مکمل، دائمی، عالمگیر اور نا قابلِ تغیر ہے۔

قرآن کریم جو آپؐ کو عطا ہوا، اس میں دُنیا کی تمام مشکلات اور مصائب کا علاج موجود ہے اور حضورؐ نے یہ سارے علاج اپنے عمل سے خوب آزمائے تھے۔ تبھی حضرت عائشہ صدیقہؓ نے قسم کھا کر کہا تھا کہ حضورؐ قرآنِ ناطق ہیں یعنی حضور کا ہر عمل اور ہر فعل قرآنی احکام کے تابع ہے اور آپؐ کی پوری زندگی قرآن کریم کی عملی تفسیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم اس کی اطاعت کے ساتھ ساتھ اس کے رسولؐ کی بھی اطاعت کریں۔ سورۂ انفال میں حکمِ خداوندی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ (20:8)

ترجمہ: اے ایمان والو! اللّٰہ کی اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو، اور اس سے روگردانی مت کرو‘

سورۂ حشر میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ (7:59)

ترجمہ: ’’جو کچھ تمھیں یہ رسولؐ دیں اسے لے لو اور جس چیز سے منع کریں رک جاؤ‘‘

اللّٰہ تعالیٰ نے آپؐ کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا ہے اور آپؐ کی زندگی کو اہلِ ایمان کے لیے اُسوۂ حسنہ بنایا ہے۔ کیوں نہ ہو آپؐ کی زندگی خواہشاتِ نفسانی سے بالکل پاک ہے اور آپؐ کا ہر قول، ہر فعل اور ہر عمل اللّٰہ کی اجازت کے ساتھ ہوتا ہے۔ سورۂ انعام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی اسی بات کا اعلان کرایا گیا۔ ارشاد خداوندی ہے کہ کہہ دیجیے:

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ (الانعام 50:6)

ترجمہ: میں تو صرف اسی کا تابع ہوں جو مجھے وحی کی جاتی ہے۔

یہ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل کے متعلق ارشاد ہوا۔ سورۂ نجم میں آپؐ کے قول کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰىۚ o وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىۚ o اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰىۙ o

(النّجم 53:2-4)

ترجمہ: ’’تمھارا صاحب (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نہ راہِ حق سے بھٹکا اور نہ غلط راستے پر چلا۔ وہ خواہشِ نفسانی سے باتیں نہیں کرتا بلکہ اس کی ہر بات وحی ہوتی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔‘‘

الغرض حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فعل اور قول وحیِ الٰہی سے ذرہ بھر ادھر ادھر ہٹا ہوا نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر آپؐ کی اطاعت لازم قرار دی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ کی اطاعت ہو نہیں سکتی جب تک رسول کریم صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کا جذبہ کارفرما نہ ہو۔ اللّٰہ نے آپؐ کو تا قیامت تمام انسانوں کے لیے زندگی کے ہر میدان میں عمدہ نمونہ بنا کر بھیجا ہے اور آپؐ کی پیروی اور تقلید کو فلاحِ دارین کی خاطر لازم قرار دیا ہے کیونکہ آپؐ کی ذات ہی پوری انسانیت کے لیے اللّٰہ کی طرف سے ہادی بن کر آئی ہے اور آپؐ ہی اللّٰہ کی آخری کتاب (قرآن) کی عملی تفسیر ہیں۔ اس لیے اللّٰہ کی اطاعت آپؐ کی اطاعت کے بغیر ناممکن ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اتباع کو اپنی رضا اور محبت کا ذریعہ بتایا ہے۔ سورۂ آل عمران میں ارشاد خداوندی ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ط (آل عمران 31:3)

ترجمہ: اے رسولؐ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ کے ساتھ محبت رکھتے ہو تو میری فرماں برداری کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہوں کو معاف کر دے گا۔''

حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے خود اپنی اطاعت کے بارے میں ارشاد فرمایا:

لَنْ يُّؤْمِنَ اَحَدُ كُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ. (الحديث)

ترجمہ: ''تم میں کوئی بھی اس وقت تک مومن کامل نہیں بن سکتا جب تک اس کی خواہشات اس شریعت کے تابع نہ ہوں جس کو میں لے کر آیا ہوں۔''

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ رسول کریمؐ کی حیثیت محض قاصد کی نہیں تھی کہ خداوند تعالیٰ کا پیغام (قرآن و سنت) ہم تک پہنچایا اور بس آپؐ کا کام ختم ہوا' بلکہ آپؐ کی حیثیت ایک رہنما اور حاکم کی ہے۔ آپؐ کے ہر حکم کی تعمیل امت پر فرض ہے اور آپؐ کے ادنیٰ اشارے پر جان و مال کی قربانی اُمت پر لازم ہے کیونکہ رسول کریمؐ کے ارشادات دراصل قرآن کریم کے احکام کی تشریح ہیں اور قرآن انسانیت کے لیے تا قیامت ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ چونکہ قرآن کریم کے احکام کی مکمل پیروی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انھیں رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سنت کی روشنی میں نہ سمجھا جائے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کے ساتھ اپنے رسولؐ کی اطاعت بھی اُمت پر واجب ٹھہرائی ہے۔

3- طہارت و پاکیزگی

طہارت انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ کوئی انسان ایسا نہیں ہوگا جو طہارت و پاکیزگی کو پسند نہ کرتا ہو۔ یہ اور بات ہے کہ غلط ماحول کی وجہ سے بعض افراد میں یہ فطری جذبہ مدھم پڑ جاتا ہے اور وہ روحانی پاکیزگی یا جسمانی صفائی وغیرہ کا خیال نہیں رکھتے۔

طہارت پر جس قدر اسلام نے زور دیا ہے کسی اور مذہب نے اس قدر زور نہیں دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا فرمان ہے:

اَلطُّهُوْرُ شَطْرُا لِاْيْمَانِ. ''پاکیزگی نصف ایمان ہے''۔

اسلام صرف اللہ کی عبادت کے وقت جسم' جگہ اور لباس کے پاک رکھنے پر زور نہیں دیتا بلکہ ہمہ گیر طہارت اسلام کا امتیازی نشان ہے۔

طہارت کی درج ذیل چند اہم قسمیں اسلام میں نظر آتی ہیں۔

1- طہارتِ فکر 2- طہارتِ اخلاق 3- طہارتِ جسم

4- طہارتِ لباس 5- طہارتِ مکان

1- طہارتِ فکر

طہارتِ فکر سے مراد ہے گندے افکار سے پاک ہونا۔ یعنی شرک' کفر' الحاد و دہریت جیسے گندے افکار سے پاک ہونا۔ اللہ تعالیٰ نے

اسی فکری نجاست کی وجہ سے مشرکوں کو قرآن عزیز میں نجس فرمایا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ (التوبۃ 9:28) ''یقیناً مشرکین ناپاک ہیں''۔

اسلام غلط خیالات' برے افکار اور فاسد تخیلات سے بچنے کی تلقین کرتا ہے تاکہ طہارتِ فکر حاصل ہو۔

2- طہارتِ اخلاق

اس سے مراد اخلاق سَیِّئہ سے اجتناب ہے۔یعنی ہر اس بری عادت کو چھوڑ دینا جس سے لوگ نفرت کرتے ہوں' طہارتِ اخلاق کہلاتا ہے۔جھوٹ' غیبت' حسد' بہتان' چغل خوری' ریا کاری' خود غرضی اور ظلم جیسی غلاظتوں سے پاک ہونا طہارتِ اخلاق ہے۔اسلام نے ان تمام اخلاقی برائیوں اور گندگیوں کو ایک ایک کر کے بیان کیا ہے اور ان سے بچنے کا حکم دیا ہے۔

3- طہارتِ جسم

اسلام نے جسم کی پاکیزگی کو خاص اہمیت دی ہے کیونکہ جسم کی صفائی سے روح کو مسرت حاصل ہوتی ہے اور انسان اور حیوان میں فرق قائم ہوتا ہے۔اسلام میں اللہ کی عبادت ہر عاقل بالغ انسان پر فرض ہے۔چونکہ اللہ کی ذات سب سے پاک ہے اس لیے اس کی عبادت کے وقت ہر قسم کی نجاست سے جسم کا پاک ہونا اشد ضروری قرار دیا گیا ہے اور وضو کو نماز کی شرط بنا دیا گیا ہے۔

وضو کے ارکان وسنن پر اگر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ طہارت کا کس قدر بہترین طریقہ اسلام نے رائج کیا ہے۔وضو سے جہاں جسم کی ظاہری غلاظت دور ہوتی ہے وہاں روحانی طور پر ایک مسرت بھی حاصل ہوتی ہے۔

جن چیزوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے' ان پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ کس قدر چھوٹی سے چھوٹی نجاست جس کا ظاہری اثر بھی جسم پر نہ ہو' وضو کو توڑ دیتی ہے اور ایک مسلمان کو از سر نو نماز کی خاطر وضو کرنا پڑتا ہے۔

پھر جب غسل کے مسائل پر نظر ڈالیں تو اسلام کا فلسفۂ طہارت اور کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ہر وہ صورت جس میں انسانی روح نفرت اور تنگی محسوس کرتی ہے' اسلام میں غسل کو واجب یا سنت بنا دیتی ہے اور غسل کر کے انسان روحانی فرحت محسوس کرتا ہے اور اس کی ذہنی پریشانی اور تنگی ختم ہو جاتی ہے۔

پانی نہ ملنے کی صورت میں وضو اور غسل کی جگہ تیمّم کو رکھا گیا ہے' تاکہ پانی کی جگہ مٹی سے ایک گونہ طہارت حاصل کر کے اطمینان حاصل کیا جائے اور اپنے آپ کو اس قابل بنایا جائے کہ خدائے پاک کی عبادت کی جا سکے یا اور کاموں میں پاک ہو کر حصہ لیا جا سکے۔

معلوم ہوا کہ اسلام میں طہارتِ جسم کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

4- طہارتِ لباس

یعنی لباس کا ہر قسم کی غلاظت سے پاک ہونا۔نماز کی صورت میں جس طہارت کو مدنظر رکھا جاتا ہے وہ صفائی سے بھی بلند پاکیزگی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْo لا ص (المدثر 74:4) ''اپنے کپڑے پاک رکھیے''۔

اسلام میں نجاست کی مختلف اقسام بیان کر کے انسان کو ہر قسم کی نجاست کے متعلق احکام بتا دیئے گئے ہیں جو فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے درج ہیں۔

نماز ادا کرتے وقت جہاں جسم کا پاک ہونا یعنی باوضو ہونا ضروری ہے' وہاں لباس کا پاک ہونا بھی اسی طرح شرط ہے۔ نماز کے علاوہ بھی لباس کی صفائی اور پاکیزگی پر زور دیا گیا ہے اور حضورؐ کا فرمان اَلنَّظَافَةُ مِنَ الْاِیْمَانِ اس پر گواہ ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلم کو صفائی اور پاکیزگی انتہائی پسند تھی۔ مسواک کرنا اور خوشبو لگانا آپؐ کے مقدس معمولات میں سے تھا۔ لباس اگرچہ سادہ اور پیوند دار ہوتا تھا مگر صاف ستھرا اور پاک ضرور ہوتا تھا۔ آپؐ اپنے صحابہؓ کو بھی پاک اور صاف لباس پہننے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔

ایک دن ایک صحابیؓ خراب کپڑے پہنے ہوئے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے ان کا گندا لباس دیکھ کر ان سے پوچھا: کیا تمھیں ربّ تعالیٰ نے کچھ مال دیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا: ہاں! اللہ نے بہت کچھ عطا فرمایا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے کہ اپنے بندے پر اپنی دی ہوئی نعمت کا اثر دیکھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے تم پر فضل کیا ہے تو اچھے کپڑے پہن لیا کرو تا کہ اللہ کی دی ہوئی نعمت کا اظہار ہو جائے۔

5- طہارتِ مکان

یہ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اس سے اولاً تو یہ مراد ہے کہ جس جگہ ایک مسلمان نماز ادا کر رہا ہے وہ جگہ ہر قسم کی غلاظت سے پاک ہو۔ بہتر یہ ہے کہ مسجد ہو۔ اگر مسجد کے علاوہ کسی اور جگہ نماز پڑھ رہا ہو تو اس جگہ کے پاک ہونے کا یقین کر لے اور پھر اللہ کی نماز ادا کرے۔

دوسرے نمبر پر طہارتِ مکان سے مراد اس جگہ کا پاک ہونا ہے جہاں انسان رہ رہا ہے' یعنی گھر کی صفائی' محلّہ کی صفائی وغیرہ ہے۔

تیسرے نمبر پر جس دفتر' کارخانہ' سکول یا کالج میں انسان کام کرتا ہے یا پڑھتا ہے' اس کی صفائی کا خیال رکھے۔

چوتھے نمبر پر جس گاؤں یا جس شہر میں انسان رہائش پذیر ہے اسے پاک صاف رکھنے کی کوشش کرے۔

پانچویں نمبر پر وہ ملک جس کا انسان باشندہ ہے اس کی صفائی میں ہر ممکن تعاون کرے۔

چھٹے نمبر پر پوری کائنات کو جو تمام انسانوں کے رہنے کا مکان ہے اپنے کسی عمل سے غلیظ اور ناپاک نہ کرے' اور ہر قسم کی طہارت کا اہتمام کرتے ہوئے زندگی گزارے۔ یعنی طہارتِ فکر' طہارتِ اخلاق' طہارتِ جسم' طہارتِ لباس اور طہارتِ مکان کے تقاضوں کو پورا کرے۔

اللہ نے ایسے لوگوں کے لیے فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَo (البقرہ 222:2)

ترجمہ: ''بے شک اللہ توبہ کرنے والوں اور ہر قسم کی طہارت کا اہتمام کرنے والوں کو پسند کرتا ہے''۔

4- علم کی ترغیب

انسان سرتاجِ کائنات اور زمین پر خدا کی بہترین مخلوق ہے۔ وہ باقی مخلوقات سے صرف اس لیے افضل و اشرف ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ نے اسے عقل سے نوازا ہے اور سب سے زیادہ علم دیا ہے۔ اس علم کی بنا پر ہی فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام کے آگے جھکنا پڑا' اور اسی کے ذریعے ساری کائنات انسان کے لیے مطیع و مسخّر ہو کر رہ گئی ہے۔ نبی کریمؐ پر سب سے پہلے جو وحی نازل ہوئی اس میں اللّٰہ تعالیٰ نے سب سے بڑا احسان یہی جتایا ہے کہ اس نے انسان کو قلم کے ذریعے بہت سارے علوم و فنون کی تعلیم دی' فرمایا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَ رَبُّکَ الْاَکْرَمُ ۙ

الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ (العلق 96 :1-5)

ترجمہ: اپنے پروردگار کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا۔ جس نے انسان کو لوتھڑے سے پیدا کیا' پڑھ اور تیرا پروردگار کریم وہ ہے جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

دُنیا میں جو انسان نورِ ایمان سے منور ہو کر اپنی فکری اور علمی قوتوں سے کام لیتے ہیں' ان کے ساتھ اللّٰہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ انھیں دنیوی ترقی اور اُخروی کامیابی سے ہمکنار کرے گا۔ ارشادِ خداوندی ہے:

یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ ۙ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ (المجادلۃ 11:58)

ترجمہ: اللّٰہ تم میں سے ایمان والوں اور علم والوں کے درجات بلند فرماتا ہے۔ ویسے تو سب انسان اللّٰہ تعالیٰ کے بندے ہیں مگر جو لوگ زیورِ علم سے آراستہ ہوتے ہیں وہ خدا کے زیادہ محبوب ہوتے ہیں۔ خدا کے نزدیک عالم اور جاہل کبھی بھی برابر نہیں ہو سکتے۔ خود اللّٰہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ ھَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ؕ (الزّمر 9:39)

ترجمہ: کہہ دیجیے کیا عالم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں؟

یہی وجہ تھی کہ حضورؐ نے ہر مسلمان (مرد اور عورت) پر طلبِ علم کو واجب کیا اور خود بھی علماء کی محفل کو عابدوں کی مجلس پر فضیلت دے کر علم اور تحصیلِ علم کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ ایک مرتبہ حضورؐ مسجد میں تشریف لائے وہاں دو مجلسیں لگی ہوئی تھیں: ایک ذکر کی اور دوسری علم کی۔ آپؐ نے دونوں کی تعریف کی اور پھر علم کی مجلس میں بیٹھ کر فرمایا: میں بھی دُنیا میں معلّم (سکھانے والا) بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

حضور اکرمؐ ہر وقت اللّٰہ تعالیٰ سے اپنے علم میں اضافہ کی دُعا کرتے تھے اور مسلمانوں کو بھی یہی تعلیم دے رہے ہیں کہ ہر مسلمان یہ کہے: رَبِّ زِدْنِیْ عِلْماً (اے میرے ربّ میرے علم میں اضافہ فرما)

حضرت معاذ بن جبلؓ نے حضور صلی اللّٰہ علیہ واٰلہ وسلم سے علم کے بارے میں ایک مفصل حدیث نقل کی ہے' جس سے علم کی ضرورت اور افادیت پر تفصیلی روشنی پڑتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

''علم حاصل کرو' اللّٰہ کے لیے علم حاصل کرنا نیکی ہے' علم کی طلب عبادت ہے۔ اس میں مصروف رہنا' تسبیح اور بحث و مباحثہ کرنا جہاد

ہے۔علم سکھاؤ تو صدقہ ہے‘ علم تنہائی کا ساتھی‘ فراخی اور تنگدستی میں رہنما‘ غم خوار دوست اور بہترین ہم نشین ہے۔علم جنت کا راستہ بتاتا ہے۔ اللّٰہ تعالیٰ علم ہی کے ذریعے قوموں کو سر بلندی عطا فرماتا ہے۔لوگ علماء کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔دُنیا کی ہر چیز ان کے لیے دُعائے مغفرت کرتی ہے کیونکہ علم دلوں کی زندگی ہے اور اندھوں کے لیے بینائی۔علم جسم کی توانائی اور قوت ہے۔علم کے ذریعے انسان فرشتوں کے اعلیٰ درجات تک پہنچتا ہے۔علم میں غور و خوض کرنا روزے کے برابر ہے اور اس میں مشغول رہنا نماز کے برابر ہے۔علم ہی کے ذریعے اللّٰہ تعالیٰ کی صحیح اطاعت اور عبادت کی جاتی ہے۔علم سے انسان معرفتِ خداوندی حاصل کرسکتا ہے۔اس کی بدولت انسان اللّٰہ اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرتا ہے۔علم ایک پیش رو اور رہبر ہے اور عمل اس کا تابع ہے۔خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو علم حاصل کرتے ہیں اور بدقسمت اس سعادت سے محروم رہتے ہیں۔''

دُنیا میں علم تو بے شمار ہیں اور کسی شخص کو یہ طاقت نہیں کہ ان سب کو حاصل کر لے لیکن ایک مسلمان کے لیے تین قسم کے علوم حاصل کرنا بے حد ضروری ہے۔اول علمِ دین اور اس سے یہ مراد نہیں کہ مسلمانوں میں ہر ایک شخص تمام دینی مسائل کا عالم ہو بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت کہ دین کے ضروری مسائل سے واقف اور اسلام کی خوبیوں سے آگاہ ہو۔

دوم علم طب ہے جس سے مسلمانوں کو واقف ہونا ضروری ہے اور علم طب سے مراد یہ ہے کہ صحت کے اصول اور قواعد سے واقف ہو۔ حدیث میں آیا ہے:

اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ، عِلْمُ الْاَدْیَانِ وَعِلْمُ الْاَبْدَانِ (الحدیث)

''یعنی علم حقیقت میں دو ہیں‘ دین کا علم اور طب کا علم۔''

تیسرا علم جس سے واقفیت ہر ایک کے لیے ضروری ہے‘ وہ علم ہے جس پر معاش کا دارومدار ہے اور اس علم سے ہماری مراد عام ہے خواہ وہ علم متعارف ہو یا کوئی پیشہ یا ہنر ہو کیونکہ دُنیا میں جس قدر پیشے یا ہنر ہیں‘ وہ سب علم ہی ہیں۔علمِ معیشت کا حاصل کرنا اور اس پر عمل پیرا ہونا ایک اہم اسلامی فرض ہے۔اس کو نہ جاننے یا اس پر عمل نہ کرنے کے باعث آج مسلمان اقتصادی میدان میں پیچھے رہ گئے ہیں اور دُنیا کی دوسری قومیں جو ایک مدت اور عرصہ دراز تک اہلِ اسلام کے خرمنِ کمالات کی خوشہ چین رہیں‘ دنیوی ترقی کی اس معراج پر جا پہنچیں کہ اس زمانے کے مسلمان اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔اس کی اصل وجہ صرف جہالت ہے۔کیونکہ یہ بوجہ جہالت اور لاعلمی اپنے مذہبی اصولوں اور اپنے بزرگوں کے اعلیٰ کارناموں سے ناواقف ہیں۔دوسرے ان کے دماغوں میں ایک باطل خیال جما ہوا ہے کہ ہر کسب باعثِ ہتک اور موجبِ ننگ و عار ہے حالانکہ کلام مجید میں کئی جگہ کسبِ معاش کی شدید تاکید آئی ہے حتیٰ کہ حج جیسی ضروری اور مذہبی عبادت کے موقع پر بھی تجارت کرنے کی صریح اجازت موجود ہے اور نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد طلبِ معاش میں نکل جانے کا صاف حکم ہے۔اس کے علاوہ تمام انبیاء علیہم السلام و صحابہ کرامؓ اس اُصولِ کسبِ معاش اور تجارت کے سختی سے پابند رہے۔چنانچہ حضرت ادریسؑ خیاطی‘ حضرت نوحؑ نجاری اور حضرت ابراہیمؑ بزازی کیا کرتے تھے۔خلفائے اسلام میں ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عثمانؓ اور دیگر صحابہؓ اور علماء بزازی اور تجارت کیا کرتے تھے۔واضح رہے کہ کسبِ معاش اور اپنے ہاتھ کی کمائی سے روزی پیدا کرنا موجب عار نہیں بلکہ فلاحِ دارین کا باعث ہے۔

الغرض اسلام دینِ علم ہے۔اس کے نزدیک انسان کو دیگر مخلوقات پر شرف علم ہی سے حاصل ہے اور علم ہی کی بنیاد پر وہ آئندہ بھی ترقی

کی راہوں پر گامزن ہوگا۔ اس لیے وہ اپنے ماننے والوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ علم کی تلاش میں نکلو اور حکمت کے موتی جہاں کہیں بھی ملیں، انھیں حاصل کرو۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اپنے دَورِ عروج میں علمی لحاظ سے تمام دُنیا پر فائق تھے۔

اسلام کا دامن حکمت اور دانائی کے موتیوں سے بھرا ہوا ہے۔ دین اسلام تمام دُنیا کے انسانوں کو فکر وعمل کی طرف دعوت دیتا ہے اور ہر قسم کے علوم وفنون کے لیے ہمیشہ اس کی آغوش کھلی ہوئی ہے۔ اسلام اصولی طور پر تحقیقات اور سائنس کا مخالف نہیں بلکہ جس قدر سائنس کی ایجادات اور انکشافات میں اضافہ ہوگا اصول اسلام کا اعتراف بڑھتا جائے گا اور توحید کے پرستاروں کی تعداد زیادہ ہوتی جائے گی۔ جس طرح ماضی میں مسلمانوں نے بینظیر سائنسی کارنامے انجام دیئے تھے آج ہمیں چاہیے کہ ان کے نقشِ قدم پر چل کر کائنات میں اپنا مقام پیدا کریں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ خداوند عالم نے ہمیشہ حکومت اور سلطنت سے اسی قوم کو نوازا ہے جو علم وعمل میں دوسری اقوام کے مقابلے میں بہتر تھی۔ اسی اصول کی بنا پر آدم علیہ السلام اپنی علمی صلاحیتوں کی وجہ سے ملائکہ پر فضیلت لے گئے اور کائنات کی خلافت فرشتوں کے مقابلے میں آدم علیہ السّلام اور ان کی اولاد کو عطا ہوئی۔

جب ہم تاریخِ عالم پر نگاہ ڈالتے ہیں تو یہی اصول کارفرما نظر آتا ہے۔ جب اہلِ یونان علمی میدان میں فائق تھے تو ان کا سکندر مشرق و مغرب میں اپنی عظمت کا جھنڈا گاڑتا ہے اور دُنیا کی کوئی قوم اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اسی طرح اہلِ اسلام نے جب اللّٰہ کے فرمان پر عمل پیرا ہوکر علمی میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے، اور صرف قرآن کریم اور احادیث رسول صلی اللّٰہ علیہ والہ وسلم کو سمجھنے کی خاطر صدہا درسگاہیں قائم کیں اور اپنی یونیورسٹیوں میں علومِ عقلی اور فنونِ عملی کو بطور نصاب پڑھایا تو دُنیا کی کوئی قوم ان کا مقابلہ نہ کرسکتی تھی۔ مصر، بغداد اور قرطبہ کے تعلیمی ادارے اپنی مثال آپ تھے۔ اہلِ یورپ اپنی جہالت دُور کرنے کے لیے سرزمین اندلس کا رُخ کرتے تھے۔

پھر ایک زمانہ آیا جب مسلمانوں نے علمی میدان میں کام کرنا چھوڑ دیا۔ تحقیق کی جگہ اندھی تقلید اور عمل کی جگہ بدعملی کو اپنایا تو خدا نے انھیں ہر جگہ ان کا غلام بنا دیا جو علم وعمل میں ان سے فائق تھے۔ کہیں ان پر انگریز مسلط ہوگئے، کہیں پرتگالی اور کہیں فرانسیسی استحصال کرنے لگے، کیونکہ دورِ جدید میں جہاں مسلمانوں نے اپنا کردار ادا کرنا چھوڑ دیا، وہاں اہلِ یورپ نے مسلمانوں کی جگہ لے لی اور علمی دُنیا میں حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے اور علم کی بدولت پوری دُنیا پر چھا گئے۔

ایک وقت تھا جب یورپ تاریکی میں غرق تھا لیکن جب اہلِ یورپ نے سستی وکاہلی کو چھوڑ کر محنت اور کاوش کو اپنا وطیرہ بنایا تو خدا نے بھی انھیں جہالت کی جگہ علم عطا کیا اور کائنات کی ظاہری حکومت باوجود ان کے کافر ہونے کے ان کے ہاتھ میں دے دی۔

اب ہمیں اگر اپنا مقام دوبارہ حاصل کرنا ہے تو علمی اور عملی میدان میں آگے بڑھنا ہوگا۔ ورنہ ترقی یافتہ اقوام کی غلامی اور سامراج سے نجات پانا مشکل ہے۔ خدا بھی ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔

5- عدل

عدل کا معنٰی: مساوی بدلہ، افراط اور تفریط کے درمیان راستہ اور حق وانصاف ہے۔ عدل کی ضد ظلم ہے جس کا معنی ہے: کسی چیز کو اس کے مناسب مقام میں نہ رکھنا یا بدلہ دینے میں کمی بیشی کرنا۔

ہر اچھے اور برے کام کا پورا پورا بدلہ دینا عدل کہلاتا ہے اور اس میں کمی بیشی کرنا ظلم ہے۔ عدل و انصاف کے بغیر مثالی معاشرہ قائم نہیں کیا جا سکتا جہاں ظلم، فساد اور بے چینی پیدا کرتا ہے، وہاں عدل، امن اطمینان اور ترقی کا ضامن ہے۔ عدل ہی پر دُنیا کی ترقی اور خوشحالی کا دارومدار ہے اور دُنیا کی کوئی قوم اس کی ضرورت و اہمیت کا انکار نہیں کر سکتی۔

اسلامی تعلیمات میں عدل کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ کیوں نہ ہو اسی عدل و انصاف کے ذریعے انسان اس زندگی میں جنت کی جھلک دیکھ سکتا ہے اور مثالی معاشرہ قائم ہو سکتا ہے جو اسلام کے اولین مقاصد میں سے ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانی معاشرے میں افراد کی باہمی کشمکش اور ٹکر کو عادل حاکم اور انصاف پسند عدلیہ کے ذریعے ہی ختم کیا جا سکتا ہے۔ ایسی عدلیہ کا وجود جو مظلوم کی دادرسی کرے اور عدل و انصاف کے مطابق فیصلے کرے، امن کے قیام کی خاطر انتہائی ضروری ہے۔ چونکہ مقدمات کے صحیح فیصلے سچی شہادت کے بغیر نہیں ہو سکتے اس لیے اسلام جہاں عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے وہاں صحیح شہادت دینے کو بھی لازم قرار دیتا ہے۔

عدالتوں میں بے انصافی یا گواہی میں غلط بیانی کے دو سبب ہوتے ہیں، یا تو یہ کہ ہم کسی کی رشتہ داری کی بنا پر سچی گواہی دینے اور حق کا فیصلہ کرنے کی ہمت نہیں کرتے یا کسی کی عداوت ہمیں غلط بیانی یا ظلم اور ناانصافی پر مجبور کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان دونوں اسباب کی بنا پر غلط بیانی اور بے انصافی کرنے سے منع فرمایا ہے اور عدل کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(1) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ

(النساء 135:4)

ترجمہ: اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہنے والے، اللہ کے لیے گواہی دینے والے بن جاؤ، اگرچہ وہ گواہی اپنی ہی ذات یا والدین یا رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

(2) وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ (المائدہ 8:5)

ترجمہ: اور تمھیں کسی قوم کی عداوت اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو۔ انصاف کرنا ہی پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو۔

عدالتی نظام کی کامیابی کا دارومدار اگر ایک طرف متقی، خدا ترس اور پیکرِ انصاف جج اور قاضی پر ہے تو دوسری طرف پیکرِ صدق و وفا گواہوں پر بھی ہے۔ اس لیے یہ بتایا گیا ہے کہ کسی شخص کے ساتھ، بغیر کسی کمی بیشی اور اچھے یا برے جذبے کے وہ سلوک کرنا چاہیے جس کا وہ واقع مستحق ہے اور عدل و انصاف کی ترازو ایسی صحیح اور برابر ہونی چاہیے کہ بڑی سے بڑی محبت اور شدید سے شدید عداوت اس کے دونوں پلڑوں میں سے کسی کو جھکا نہ سکے۔

ہمارے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہونا چاہیے۔ آپؐ نے کافروں اور دشمنوں کے ساتھ بھی انصاف کیا اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی کے کفر و شرک یا مخالفانہ رویے کی وجہ سے بے انصافی کی ہو، آپؐ کے عہد مبارک میں یہودی اور نصرانی بھی اپنے مقدمات کا فیصلہ کرانے کے لیے آپؐ کے ہاں آیا کرتے تھے اور انھیں آپؐ کے عدل پر پورا پورا اعتماد تھا۔ ایک بار ایک یہودی اور ایک انصاری مسلمان کا تنازعہ حضورؐ کے ہاں پیش ہوا۔ آپؐ نے فیصلہ یہودی کے حق میں دیا اور یہ نہ دیکھا کہ دوسری طرف ایک مسلمان ہے بلکہ حق و

انصاف کے ساتھ فیصلہ فرمایا۔ کسی بڑے سے بڑے صحابیؓ کو آپؐ کے ہاں سفارش یا کسی فریق کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

ایک بار ایک قریشی خاتون چوری کے الزام میں پکڑی گئی۔ اس کا قبیلہ چاہتا تھا کہ اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ ملے۔ انھوں نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنھما کو حضورؐ کی خدمت میں سفارشی بنا کر بھیجا کہ سزا میں کچھ نرمی فرمائی جائے۔ آپؐ کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا اور فرمایا: پہلی قومیں اسی لیے تباہ ہوئیں کہ جب کوئی غریب جرم کرتا تھا تو اسے قانون کے مطابق سزا دی جاتی تھی اور جب کوئی بااثر آدمی جرم کا ارتکاب کرتا تھا تو اس کی خاطر قانون کی تاویلیں کر کے اسے بچایا جاتا تھا۔ آپؐ نے اس عورت کو شرعی قانون کے مطابق سزا دی۔ اسلامی قانون کی نگاہ میں تمام افراد مساوی ہیں۔ قانونِ الٰہی کو سب پر بالادستی حاصل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلم نے اپنے آپ کو بھی قانون سے بالاتر کبھی نہیں سمجھا۔ حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ میں نے حضورؐ کو بھی قصاص کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ جب آپؐ کا دُنیا سے رخصت فرمانے کا وقت قریب آیا تو صحابہؓ کو پکار کر کہا کہ جس کسی نے مجھ سے کوئی بدلہ لینا ہے' لے لے' میں حاضر ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ جب حضور صلی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلم نے اپنے آپ کو قانون سے بالاتر نہ سمجھا تو مسلمانوں کا ہر حاکم یا خلیفہ اپنے آپ کو قانون کے سامنے اِسی طرح جوابدہ سمجھتا تھا جس طرح ایک ادنیٰ خادم۔

خلفائے راشدینؓ نے اپنے دور میں عدل وانصاف کی مثالیں قائم کی ہیں اور حضورؐ کے نقشِ قدم پر چل کر انصاف کا حق ادا کیا ہے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ کا انصاف تو مثل بن گیا تھا۔ ایک بار حضرت علیؓ مرتضیٰ ایک مقدمے کے سلسلے میں قاضی کی عدالت میں بطور فریق پیش ہوئے۔ قاضی نے آپؓ کو ابوتراب کہہ کر پکارا۔ آپؓ نے فرمایا: تم نے مجھے کنیت سے کیوں پکارا ہے جو عزت کی علامت ہے؟ یہ تم نے بے انصافی کی ہے۔ اتنی سی بات کو بھی حضرت علیؓ مرتضیٰ نے قانونی مساوات کے خلاف سمجھا اور قاضی کو مکمل مساوات برتنے کی نصیحت کی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے کو شرعی سزا دے کر عدل وانصاف کا بول بالا کیا۔ آپؓ کے عہد میں بڑے سے بڑا گورنر اور بااثر انسان قانون کی زد سے نہیں بچ سکتا تھا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلم نے قاضیوں اور ججوں کے لیے ایک ضابطۂ اخلاق دیا ہے جس کے چند اہم اُصول یہ ہیں:۔

1- مدّعی اور مدّعا علیہ کے بیانات سن کر فیصلہ دیا جائے۔ کسی ایک فریق کے بیان پر اعتماد کر کے یک طرفہ کارروائی نہ کی جائے۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ مرتضیٰ کو یمن بھیجتے وقت وصیت فرمائی:

فَإِذَا جَلَسَ بَيْنَ يَدَيْكَ الْخَصْمَانِ فَلَا تَقْضِ حَتّٰى تَسْمَعَ كَلَامَ الْآخَرِ كَمَا سَمِعْتَ كَلَامَ الْأَوَّلِ.

ترجمہ: جب تیرے سامنے دو فریقِ مقدمہ بیٹھ جائیں تو اس وقت تک فیصلہ نہ سنا جب تک دوسرے فریق کا بیان اس طرح نہ سن لے جس طرح پہلے کا سنا۔

2- قانون لوگوں کی نیتوں اور اندرونی باتوں پر مواخذہ نہیں کرتا۔ اس لیے قاضی کو چاہیے کہ ظاہری شہادت اور ثبوت کے مطابق فیصلہ کرے۔ حضور صلی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلم بھی ہر مقدمے میں ظاہری ثبوت اور گواہوں کی شہادت کے مطابق فیصلہ فرمایا کرتے تھے۔ آپؐ کا فرمان ہے:

اُمِرْتُ اَنْ اَحْكُمَ بِالظَّاهِرِ، وَاللّٰهُ يَتَوَلَّى السَّرَائِرَ.

ترجمہ: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ ظاہر کے مطابق فیصلہ کروں اور اللہ دلوں کے بھیدوں کا مالک ہے۔

3- عدالتی کارروائی کے کسی مرحلے پر قاضی کو کسی ایک فریق کی طرف جھکاؤ کی قطعاً اجازت نہیں۔ قاضی کو چاہیے کہ وہ دیکھنے اور بات کرنے میں بھی فریقین کے درمیان مکمل مساوات برتے۔ حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا:

سَوِّبَيْنَ الْخَصْمَيْنِ فِيْ لَحْظِكَ وَلَفْظِكَ.

ترجمہ: نگاہ اور کلام میں بھی فریقین کے مابین مساوات قائم رکھیے۔

4- مقدمہ میں منصفانہ فیصلے پر پہنچنے کے لیے قاضی کو ہر قسم کے ذہنی کھچاؤ یا غیظ وغضب سے آزاد ہونا چاہیے۔ بصورتِ دیگر قاضی ذاتی جذبات سے مغلوب ہو کر مجرم کو اس کے جرم کی مقدار سے بڑھ کر سزا دے بیٹھے گا اور انصاف نہ کر سکے گا۔ حضورؐ نے تنبیہہ فرمائی۔

لَا يَقْضِ الْقَاضِيْ بَيْنَ الْاِثْنَيْنِ وَهُوَ غَضْبَانُ.

ترجمہ: غصہ کی حالت میں قاضی فریقین کے درمیان فیصلہ نہ کرے۔

5- مجرم کو ثبوت جرم پر سزا دی جائے۔ اگر اس کے خلاف شہادتیں کمزور ہوں جس سے اس کا جرم مشتبہ ہو جائے تو اسے شک کا فائدہ دیا جائے۔ اس سلسلے میں اسلام کا اصول یہ ہے:

اِنَّ الْاِمَامَ اَنْ يُّخْطِئَى فِي الْعَفْوِ خَيْرٌ مِّنْ اَنْ يُخْطِئَى فِي الْعُقُوْبَةِ.

ترجمہ: بے شک امام یا قاضی کا کسی کو معاف کرنے میں غلطی کرنا بہتر ہے اس سے کہ وہ کسی کو سزا دینے میں غلطی کرے۔

6- ثبوت مدعی کے ذمے ہے اور بصورت عدم شہادت مدّ عاعلیہ سے اپنی بے گناہی کی قسم لی جائے۔ آپؐ کا فرمان ہے:

اَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِىْ وَالْيَمِيْنُ عَلٰى مَنْ اَنْكَرَ.

ترجمہ: شہادت اور ثبوت مدعی کے ذمے ہے اور قسم مدُ عاعلیہ پر ہو گی۔

7- فیصلہ کرنے سے پہلے دیکھ لیا جائے کہ اگر مقدمے کا حل قرآن وسُنت میں موجود ہے تو اس کے مطابق فیصلہ دیا جائے ورنہ قرآن و سنت میں اس کے مشابہ فیصلے سامنے رکھ کر قیاس کر لیا جائے۔ ایسی صورت میں جبکہ کسی مقدمے کا صریح فیصلہ قرآن وحدیث میں نہ ملتا ہو، تو قاضی کو قیاس کر کے اپنی رائے پر انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے کی اجازت ہے۔ آپؐ نے حضرت معاذؓ کو جب قاضی بنا کر بھیجا تو اس سے پوچھا کہ مقدمات کا فیصلہ کیسے کرو گے؟ حضرت معاذؓ نے جواب دیا۔ قرآن کے احکام کے مطابق۔ آپؐ نے فرمایا: اگر قرآن میں اس کا حکم موجود نہ ہو تو پھر کیا کرو گے؟ حضرت معاذؓ نے جواب دیا: پھر اللہ کے رسولؐ کی سُنت کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ آپؐ نے پھر پوچھا: اگر وہاں بھی حکم موجود نہ ہو تو پھر کیا کرو گے؟ حضرت معاذؓ نے جواب دیا: اپنی رائے پر فیصلہ کروں گا۔ آپؐ نے حضرت معاذؓ کے اس طرز کو پسند فرمایا۔ یہی طریقہ بعد کے تمام قاضیوں کے لیے نمونہ بن گیا۔

6- جہاد

جہاد کا معنیٰ

جہاد عربی کا لفظ ہے۔اس کا لغوی معنیٰ ہے: کسی کام کے لیے کوشش کرنا۔اصطلاحِ شریعت میں اللّٰہ کے دین کا بول بالا کرنے اور دشمنانِ دین کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنے اور جان و مال کی قربانی دینے کا نام جہاد ہے۔

جہاد کی تین صورتیں ہیں: ایک دشمنانِ دین کے مقابلے میں جہاد، دوسرا شیطانی خیالات کے مقابلے میں جہاد اور تیسرا نفس کی غلط خواہشات کو روکنے میں جہاد۔مطلب یہ نکلا کہ جو چیز بھی اللّٰہ کی راہ پر چلنے سے روکے اس کا پوری قوت سے مقابلہ کرنا جہاد کہلاتا ہے۔

خدا کی راہ میں کفار اور مشرکین سے جنگ کرنا اور جان کی بازی لگا کر اسلام کی سر بلندی کے لیے کوشش کرنا جہاد کی آخری منزل ہے۔

قرآن حکیم میں جہاد کی اس قسم کو قِتَال فِيْ سَبِيْلِ اللّٰه کہا گیا ہے۔اللّٰہ کی راہ میں لڑنا جہاد کی قسموں میں سے ایک قسم ہے چونکہ ایک مسلمان جنگ کی صورت میں اپنی جان بھی اللّٰہ کے دین کی خاطر قربان کر دیتا ہے۔اس لیے ایسے مجاہد کا مقام دوسروں سے بہت بلند ہو جاتا ہے، اور اگر وہ میدانِ جنگ میں شہید ہو جائے تو خدا اسے مردہ کہہ کر پکارنا گوارا بھی نہیں کرتا، بلکہ دائمی زندگی سے نوازتا ہے۔

جہاد کی اہمیت

جہاد بظاہر اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں شامل نہیں ہے لیکن حقیقتاً ان سب کی روح جہاد ہے۔ارکان رکن کی جمع ہے اور رکن عربی میں ستون کو کہتے ہیں۔کلمہ، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج اسلام کے ارکان ہیں جن پر اسلامی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔جہاد اس عمارت کی چھت اور اس کی حفاظت کے لیے ڈھال ہے۔اگر جہاد نہ ہو تو نہ دین باقی رہتا ہے اور نہ دین کے ارکان۔اس لیے جہاں دیگر عبادات کے لیے اوقات اور حدود مقرر ہیں، وہاں جہاد کے لیے کوئی خاص وقت یا حد مقرر نہیں ہے۔پوری زندگی میں اسلام کی سربلندی کی خاطر جان و مال کی قربانی دینا اور طاقت کے مطابق دشمنانِ دین کے مقابلے کے لیے تیاری کرنا جہاد ہے۔

فضیلتِ جہاد

قرآن وحدیث میں مجاہدین کی فضیلتیں بیان ہوئی ہیں اور رسول کریم صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم نے مومن ہونے کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ: مومن وہ ہے جس نے جہاد کیا ہو یا اس کے دل میں جہاد یعنی قتال فی سبیل اللّٰہ کی تمنا موجود ہو۔آپؐ نے فرمایا:

’’جس شخص نے نہ کبھی جہاد میں شرکت کی اور نہ اس کے دل میں جہاد کا شوق پیدا ہوا اور وہ اسی حالت میں مر گیا تو وہ نفاق کی موت مرا‘‘

آپؐ سے پوچھا گیا: سب سے افضل انسان کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ’’وہ مومن جو اپنی جان و مال سے جہاد کرتا ہے‘‘۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

’’جہاد میں تمھاری شرکت اپنے اہل وعیال میں رہ کر ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہے‘‘۔

قرآن حکیم میں ہے:

''جولوگ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے مارے گئے' انھیں مردہ نہ کہو۔ وہ زندہ ہیں مگر تم ان کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے''
(البقرۃ2:154)۔

جہاد کی قسمیں

جہاد کی دو قسمیں ہیں: جہاد بالنفس اور جہاد بالمال۔

جہاد بالنفس

یعنی جان سے جہاد کرنا۔ جان سے جہاد کرنے والوں کو دو قسم کے حالات پیش آتے ہیں: ایک وقت ایسا ہوتا ہے جب انھیں راہِ حق میں اپنی جان پر مختلف قسم کی تکالیف برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ وہ دشمنوں کے مقابلے میں کمزور ہوتے ہیں اور دشمن ان کو راہِ حق سے ہٹانے کی خاطر طرح طرح کی آزمائشوں میں ڈالتے ہیں' مگر وہ سب کچھ برداشت کرتے ہوئے اپنا مشن جاری رکھتے ہیں۔ دُنیا کی کوئی طاقت انھیں راہِ حق سے نہیں ہٹا سکتی' اور حق کی خاطر وہ ہر قسم کی تکالیف برداشت کر کے اللہ کی رضا حاصل کرتے ہیں۔

دوسری قسم کے حالات انھیں اس وقت پیش آتے ہیں جب ان میں دُشمن کا مقابلہ کرنے کی طاقت موجود ہوتی ہے اور دشمن انھیں صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوشش کرتے ہوئے میدانِ جنگ کے سوا کوئی اور صورت باقی نہیں چھوڑتا۔ ایسی صورت میں انھیں جان کی بازی لگا کر اللہ کے دینِ اور اپنی حفاظت کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی حالات میں جنگ کی اجازت ہوتی ہے اور ایسے ہی حالات میں سرحدوں پر ایک رات گزارنا ہزاروں نمازوں اور روزوں سے افضل ہوتا ہے اور حق کی حمایت میں تلوار اٹھانا اور مخالفین کو طاقت کے ذریعے ان کے عزائم سے روکنا ضروری ہے۔

جہاد بالمال

جہاد بالنفس کے بعد جہاد بالمال کا درجہ ہے۔ دُنیا کا کوئی کام پیسے کے بغیر نہیں ہوتا۔ اسلام جس کا مشن تمام کائنات میں اللہ کا نام بلند کرنا اور امن قائم کرنا ہے جانی اور مالی قربانی کے بغیر کیسے چل سکتا ہے؟ صحابہ کرامؓ نے جہاں جہاد بالنفس کے سلسلے میں بے مثال روایات قائم کی ہیں وہاں جہاد بالمال کا بھی حق ادا کیا ہے۔ اللہ کے دین کی خاطر گھر بار چھوڑنا اور جنگ کی تیاری کے وقت گھر کا تمام مال' نصف مال یا خاصا حصہ اللہ کی راہ میں پیش کر دینا حضورؐ کے صحابہ اور اہلِ بیت کے حصے میں آیا ہے۔

جہاد یعنی قتال فی سبیل اللہ کی اجازت

درج ذیل صورتوں میں سے کسی ایک کی موجودگی میں اعلانِ جنگ کی اجازت ہے۔

1- دشمن اسلامی ملک پر حملہ آور ہو۔
2- دشمن اپنے ملک میں اہلِ اسلام کو ظلم و ستم کا نشانہ بنائے اور دین پر پابندیاں عائد کرے۔
3- دشمن مسلمانوں کو بے گناہ قتل کرے۔

4- دشمن شکستِ عہد کا مرتکب ہو اور غدّاری کرے۔

5- فسادی اور خطرناک دشمن کی طرف سے حملے کا خطرہ ہو۔

جب اعلانِ جنگ ہو جائے تو ہر مسلمان مرد عاقل بالغ پر جو محتاج اور بیمار نہ ہو، جنگ میں شریک ہونا واجب ہو جاتا ہے۔ یہ امیر المومنین کا کام ہے کہ جسے چاہے میدان جنگ میں بھیجے اور جسے چاہے پیچھے چھوڑے۔ ایسے وقت میں جنگ سے کترانا یا میدانِ جنگ سے بھاگ نکلنا نفاق کی علامت ہے اور اس قسم کی حرکت مومن کی شان کے خلاف ہے، جو اپنا مال و جان اللہ کے ہاتھ جنت کے بدلے میں فروخت کر چکا ہے۔

مسلمان کے لیے حربی لائحہ عمل

جنگ سے پہلے

اسلام امن کا علمبردار ہے اور بلاوجہ کسی سے جنگ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ مگر دشمنانِ اسلام اپنی حرکت سے باز نہیں آتے اور مسلمانوں کو اپنی حفاظت اور دین کی تبلیغ کی خاطر جنگ کے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ اس لیے اسلام میں جنگ سے قبل اپنے آپ کو دشمن کے مقابلے کے لیے تیار رکھنا اور حتی المقدور سامانِ جنگ جمع کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ربّ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''اور ان (کافروں) کے لیے تیار رکھو جو قوت تم سے بن پڑے اور جتنے گھوڑے تم باندھ سکو کہ اس سے تم اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کے دل میں رعب بٹھاؤ اور اِن کے سوا کچھ اوروں کے دلوں میں جنھیں تم نہیں جانتے اللہ ہی جانتا ہے۔ (انفال: 60:8)

اس فرمان سے جنگی تیاری کا حکم واضح طور پر ثابت ہوتا ہے۔ فتح و نصرت اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر حسبِ طاقت اسلامی ریاست کے لیے جنگ کی تیاری اور اسلحہ وغیرہ کی فراہمی ضروری ہے اور اس میں سستی جہاں اللہ کی نافرمانی ہے وہاں اپنی تباہی کا باعث بھی ہے۔

دَورانِ جنگ مجاہدوں کے لیے دستور العمل

دَوران جنگ مسلمانوں کی کامرانی کے لیے قرآن کریم کی سورۂ انفال (آیات نمبر 45 تا 47) میں چند رہنما اصول بیان ہوئے ہیں جن کا مفہوم پیش کیا جاتا ہے۔

اے ایمان والو! جب تمھیں کسی جماعت سے جنگ کرنے کا اتفاق ہو (تو درج ذیل آداب کا خیال رکھو): ایک یہ کہ ثابت قدم رہو، دوسرا یہ کہ اللہ کا خوب کثرت سے ذکر کرو، اُمید ہے تم کامیاب ہو جاؤ گے۔ تیسرا اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو۔ چوتھا، آپس میں مت جھگڑو کہ اس سے تم کم ہمت ہو جاؤ گے اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ پانچواں، صبر کرو بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ چھٹا، ان کافروں کی طرح نہ ہو جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے اور اللہ کے راستے سے روکتے ہوئے نکلے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو احاطہ میں لیے ہوئے ہے۔

ان آیات میں درج ذیل باتیں مسلمانوں کو اپنانے کا حکم دیا گیا:

1- ثابت قدمی

2- کثرتِ ذکرِ الٰہی

3- اطاعتِ خدااوراطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

4- نزاع اوراختلافات سے اجتناب

5- صبرکرنا

6- تکبر‘غروراورریاکاری وغیرہ سے اجتناب۔

اگرمسلمان اللہ کے دین کی خاطرمندرجہ بالاہدایات کوسامنے رکھ کرمیدانِ عمل میں آئیں تو کامرانی یقینی ہےاوردُنیا کی کوئی طاقت مسلمانوں کوشکست نہیں دے سکتی۔

7-اکلِ حلال

اللہ تعالیٰ نے انسان کی خاطراَن گنت نعمتیں پیداکیں اورزمین وآسمان کی ہرچیزکوانسان کی نشوونما کی خاطرمسخرکردیاچونکہ انسان کی ضرورتیں بہت زیادہ ہیں‘اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہرضرورت کوپوراکرنے کے لیے کثیرتعدادمیں اشیاءپیداکیں اورانسان کواختیاردیاکہ جائز طریقے سے ان چیزوں کواستعمال میں لاکراپنی روزی حاصل کرے۔ربّ تعالیٰ کاارشادہے:

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ○ (الاعراف 10:7)

ترجمہ:اوربےشک ہم نےتمھیں زمین میں بسایااوراس میں تمھارے لیےروزی کاسامان پیداکیا‘تم بہت ہی کم شکرکرتے ہو‘‘۔

اللہ تعالیٰ نے ویسےتوہرچیزانسان کی خاطر پیدا کی مگرہرچیزکامحلّ استعمال اورطریقۂ استعمال بھی بذریعہ انبیاءعلیہم السلام بتایا۔یوں انسان کوپابندکردیاکہ کھانے کی چیزوں میں سے حلال چیزیں کھائے۔کائنات میں انسانی خوراک کے لیے بظاہرپرندے‘چارپائے اور درندےنظرآتے ہیں۔ان کاگوشت‘دُودھ اورچربی وغیرہ انسان استعمال میں لاسکتاہے‘مگراللہ تعالیٰ نےبعض جانوروں کاگوشت وغیرہ انسان کی جسمانی‘روحانی اوراخلاقی نشوونماکومدنظررکھتے ہوئے اس پرحرام کردیا۔اس سلسلے میں خنزیر‘کتا‘گدھا‘شکارکرنے والے پرندے اورتمام درندےوغیرہ انسان کے لیےحرام ٹھہرے۔

اکلِ حلال جس پراسلام زوردیتاہےاورجس کے لیےحضوراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کافرمان ہے:

طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَالْفَرِيْضَةِ.

’’حلال روزی کی تلاش عبادت کے بعددوسرافرض ہے‘‘۔

اس کامطلب یہ نہیں کہ جن چیزوں کواللہ نے انسان کے لیےحلال کیاہے‘انھیں جس طریقے سے چاہےحاصل کرکےاستعمال میں لائے‘جیسےبعض چیزیں اصلاً حرام ہیں‘اس طرح حلال چیزیں بھی اگرناجائزذرائع سے حاصل کی جائیں تو حرام بن جاتی ہیں۔انسان کو چاہیےکہ روزی کمانےکاوہ ذریعہ اختیارکرے جسےاللہ تعالیٰ نے جائزاورحلال رکھاہوکیونکہ ناجائزذرائع کااستعمال انسانی معاشرے میں فتنہ وفسادپیداکرتاہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

يٰٓاَيُّهَاالنَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۡ صلے وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّمُّبِيْنٌ ○

ترجمہ: اے لوگو! جو کچھ زمین میں حلال پاکیزہ ہے کھاؤ' اور شیطان کے قدم بہ قدم مت چلو' یقیناً وہ تمھارا صریح دشمن ہے۔ (البقرہ 2:168)

اسی سورۂ بقرہ کی آیت 172 میں اللہ تعالیٰ مومنوں کو خطاب فرماتے ہیں:

"اے ایمان والو! ہماری دی ہوئی پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو' اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو"۔

ان آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حلال اور پاکیزہ رزق کی تلاش اور اس کا استعمال انسان پر لازم ہے اور اہلِ ایمان کے لیے جو اللہ کی اطاعت کا دعویٰ کرتے ہیں حرام اور ناجائز ذرائع سے کمائی ہوئی روزی کسی صورت میں حلال نہیں۔

رزق کمانے کے جائز ذرائع

1- شکار:

انسان اپنے ابتدائی دور میں شکار کے ذریعے کھانے کی ضرورت کو پورا کرتا تھا۔ جنگل کے پرندوں اور جانوروں جن کا گوشت اللہ نے انسان کے لیے حلال کیا ہے کا شکار کرنا اور اپنی ضرورت کو پورا کرنا اب بھی ایک جائز ذریعہ ہے۔ شکار کے ذریعے جو حلال جانور یا پرندے انسان اپنے قبضے میں لاتا ہے اس میں اس کی محنت کو دخل ہوتا ہے۔ اس لیے جب کوئی شخص ایسی چیز جو نوعِ انسانی کی خاطر بنائی گئی ہو' اپنی ذاتی محنت اور کوشش سے اپنے قبضے میں لاتا ہے تو وہ اس کی ملکیت بن جاتی ہے اور اس کا استعمال اس کے لیے جائز ہو جاتا ہے' بشرطیکہ اس کے عمل سے معاشرے کو نقصان نہ ہو۔ ایسے حالات میں انسان کو دوسروں کی ضرورت کا بھی خیال رکھنا چاہیے اور اپنے ذاتی تصرّف میں اس قدر چیز لائے جس قدر اس کی ضرورت کے لیے کافی ہو۔

2- زراعت:

انسان زراعت کے ذریعے بھی روزی کماتا ہے۔ اپنی زمین پر محنت کر کے جو کچھ وہ حاصل کرتا ہے اس میں عُشر وغیرہ نکال کر باقی پیداوار اس کے لیے رزقِ حلال ہے۔

3- صنعت وحرفت:

انسان چونکہ اپنی کئی ایک بنیادی ضرورتیں دوسروں کے تعاون کے بغیر پوری نہیں کر سکتا' اس لیے مختلف پیشے معرض وجود میں آتے ہیں۔ کوئی فن سیکھ کر روزی کمانا بھی جائز بلکہ پسندیدہ ہے۔ پیشہ اختیار کرنے میں یہ دیکھ لیا جائے کہ وہ شریعت میں جائز ہو۔ بعض پیشے معاشرے کی بھلائی کی خاطر ناجائز قرار دیئے گئے ہیں اس لیے کوئی پیشہ اختیار کرتے وقت اسلامی تعلیمات کو مدنظر رکھا جائے کیونکہ ناجائز پیشے سے کمائی ہوئی روزی حرام ہوگی۔

4- تجارت:

تجارت بھی رزقِ حلال کمانے کا ایک مستحسن ذریعہ ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اسے پسند فرمایا' اور بعثت سے قبل تجارت میں حصہ لیا۔ تجارت کے متعلق اسلام کی تعلیمات بڑی واضح ہیں۔ جھوٹ' مکر و فریب اور ظلم اگر تجارت میں داخل ہو جائیں تو ایسی

تجارت کے ذریعے کمایا ہوا رزق حلال نہیں رہتا۔ ربّ تعالیٰ کا فرمان ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ؕ

(النسآء 28:4)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق نہ کھاؤ مگر یہ کہ تجارت ہو جو تمھاری باہمی رضامندی سے ہو۔''

ایک تاجر جو اسلامی اصولوں کے مطابق تجارت کرتا ہے بڑا مقام رکھتا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

اَلتَّاجِرُ الْاَمِيْنُ الصَّدُوْقُ الْمُسْلِمُ مَعَ الشُّهَدَآءِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ط

ترجمہ: ایک سچا، امانت دار مسلمان تاجر قیامت کے دن شہداء کے ساتھ ہوگا۔

5- ملازمت

یہ بھی رزقِ حلال کمانے کا ایک مستقل اور پسندیدہ ذریعہ ہے اور حکومت کا کاروبار اس کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اس میں شرط یہ ہے کہ ملازمت کے سلسلے میں جو معاہدہ باہمی رضا سے ہوا ہے اسے پورا کیا جائے اور کام کرنے میں سُستی اور بددیانتی کو روا نہ رکھا جائے۔ بعض لوگ اس جائز ذریعے کو بھی اپنے ناجائز طریقوں سے مکروہ اور حرام بنا دیتے ہیں۔ ملازم کی صلاحیت، ضرورت اور کام کی نوعیت کو دیکھ کر اس کا معاوضہ مقرر کیا جائے اور ملازم کا بھی فرض ہے کہ اپنی صلاحیت کو بروئے کار لائے اور اپنا فرض خوش اسلوبی اور دیانتداری سے انجام دے۔ آپؐ کا فرمان ہے: ''بہترین روزی وہ ہے جو ہاتھ سے کمائی جائے اور فریضۂ عبادت کے بعد اہم فریضہ حلال روزی پیدا کرنا ہے''۔

اسلام میں اکلِ حلال کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ اس کے بغیر انسان کی عبادت بھی قبول نہیں ہوتی۔

روزی کمانے کے ناجائز ذرائع

روزی کمانے کے جہاں جائز ذرائع بے شمار ہیں وہاں کچھ ناجائز ذرائع بھی ہیں جن کے ذریعے کمائی ہوئی روزی حرام بن جاتی ہے اور انسان کو خدا کے ہاں قیامت کے دن اس سلسلے میں جواب دینا ہوگا۔

ناجائز ذرائع حسب ذیل ہیں:

1- سود:

سرمایہ دارانہ نظام میں سود بھی روزی کمانے کا ایک ذریعہ ہے مگر اسلام کی نگاہ میں یہ ظلم اور فساد کی جڑ ہے۔ سود کے ذریعے روزی کمانے کی اسلام کسی حالت میں اجازت نہیں دیتا۔

2- جواء:

آج کل جواء بھی ایک مقبول پیشہ بن گیا ہے اور روزی کمانے کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر اللہ کے فرمان کے مطابق یہ غلط اور ناجائز

ذریعہ ہے۔ جوئے میں جو ہارتا ہے وہ جیتنے والے کے خلاف برے جذبات رکھتا ہے اور جو جیتتا ہے وہ بھی یہ سمجھتا ہے کہ یہ رقم میری نہیں شاید آج یا کل کسی اور کے حصے میں چلی جائے۔ یوں جوا باز کبھی خوشحالی کا منہ نہیں دیکھتا اور پوری زندگی پریشان رہتا ہے۔ وہ کاروبار اسلام میں کہاں جائز ہوسکتا ہے جس کا دارومدار محنت کی جگہ محض اتفاق پر ہو۔

3- رشوت:

رشوت کے معنی ہیں وہ رقم یا چیز جو آپ کسی سے اس کا جائز کام حاصل کرنے کے صلے میں یا ناجائز کام کرنے کے بدلے میں حاصل کرتے ہیں۔ جائز کام کرنا واجب ہے۔ اس کا صلہ لینا حرام ہے اور ناجائز کام کرنا حرام ہے۔ اس پر معاوضہ لینا اور بھی حرام ہے۔ اس لیے اسلام رشوت دینے یا لینے کی قطعاً اجازت نہیں دیتا اور اس ذریعے سے کمائی ہوئی روزی کو حرام سمجھتا ہے۔

4- گداگری:

آج کل یہ بھی روزی کمانے کا ایک ذریعہ بن چکا ہے۔ بعض لوگ کوئی کام کیے بغیر محض سائل بن کر روزی کماتے ہیں اور معاشرے میں خرابی پیدا کرتے ہیں۔ اسلام جہاں مجبوری کی حالت میں اپنی احتیاج پیش کر کے مدد حاصل کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ وہاں بلاوجہ سوال کرنے والوں کو اللہ کی لعنت کی وعید سناتا ہے۔ باغیرت انسان گداگری کو کبھی رزق کمانے کا ذریعہ نہیں بنا سکتا اور نہ اسلام اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ گداگری ذلیل انسانوں کا شیوہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلٰى : ''یعنی دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔'' اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

5- سمگلنگ، بلیک مارکیٹنگ اور ذخیرہ اندوزی وغیرہ:

تجارت کے سلسلے میں بعض صورتیں جن میں مکر وفریب، حق تلفی اور ناجائز منافع خوری شامل ہو، اسلام میں حرام ہیں۔ ان میں سے ایک سمگلنگ بھی ہے۔ سمگلنگ میں انسان اپنے ملک کا مال جس کی اہلِ وطن کو ضرورت ہوتی ہے دوسرے ملک کو خفیہ ذرائع سے صرف ناجائز دولت کی خاطر بھیجتا ہے اور اسی کو اپنی روزی کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔ سمگلر ایک غدار وطن ہے اور ایسی روزی جس میں وطن کے ساتھ غداری ہو اسلام میں کیسے حلال ہوسکتی ہے۔

یہی حال بلیک مارکیٹنگ اور ذخیرہ اندوزی کا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ جائز ذرائع سے اپنی روزی کمائے اور ناجائز ذرائع سے روزی کما کر اپنی عاقبت خراب نہ کرے۔ ایسی روزی جس کے ذریعے اہلِ وطن کا صریح نقصان ہو اور جو وطن کے ساتھ غداری کے مترادف ہو، اسلام میں کیسے حلال ہوسکتی ہے۔ یہی حال چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، سمگلنگ اور منشیات کے کاروبار کا ہے۔

6- حرام اشیاء کی تجارت:

اسلام حرام اشیاء کی تجارت سے کمائی ہوئی دولت کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ اسلام نے تمام ایسی چیزوں کے نہ صرف استعمال کو بلکہ ان کے لین دین اور کاروبار کو بھی حرام قرار دیا ہے جو فرد یا معاشرے کی جسمانی، ذہنی، اخلاقی اور روحانی زندگی کو نقصان پہنچاتی ہو اور اسلامی معاشرے

میں بگاڑ پیدا کرتی ہیں۔ مثلاً اسلام نے شراب اور دیگر تمام نشہ آور اشیاء کو حرام قرار دینے کے ساتھ ان کی خرید و فروخت' ان کی صنعت و تیاری' ان کی نقل و حمل اور ان کے کاروبار کی ہر صورت پر پابندی عائد کر دی۔

۸۔ عفّت و حیا

اللہ تعالیٰ نے انسان میں اپنے وجود کو برقرار رکھنے اور پیدائش و افزائش نسل کے لیے کچھ حیوانی خواہشات اور نفسانی جذبات رکھ دیئے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اسے قوت فکر و نظر اور عقل و وحی کے ذریعے جائز اور ناجائز میں تمیز بتا دی ہے۔ جسم اور روح دونوں آپس میں لازم و ملزوم ہیں اور دونوں کو مناسب توجہ دے کر ان کی نشو و نما کا خیال رکھنا انسان کا فرض ہے۔ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ انسان صرف حیوانوں کی طرح کھا پی کر پیدائش و افزائش کے حیوانی جذبات کو تسکین دینے کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دے' اور نہ یہ چاہتا ہے کہ وہ جسمانی ضرورتوں اور فطری جذبات کی بیخ کنی کر کے روحانی ترقی حاصل کرے۔ اسلام صرف یہ چاہتا ہے کہ انسان اپنے جسمانی تقاضوں کو عقل و دین کے ماتحت رکھ کر زندگی بسر کرے۔ جب کوئی انسان اس طرح کرتا ہے کہ نفسانی خواہشات کو عقل و دین کے ماتحت رکھ کر قابو میں لاتا ہے اور روحانیت کو حیوانیت پر غالب رکھتا ہے تو اسے عفت والا کہتے ہیں اور جب وہ ناشائستہ کاموں سے خوفِ خدا کے جذبے کے تحت گریز کرتا ہے تو اسے حیادار کہتے ہیں۔

عفت و حیا اسلامی اخلاق کی فہرست میں روحِ رواں اور جان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اللہ نے مسلمانوں کو عفت و حیا کی تعلیم دی ہے اور اس خلقِ عظیم کو تمام اسلامی فضائل میں بڑا قرار دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

''ہر دین کے لیے کچھ اخلاق ہیں اور اسلام کا اخلاق حیا ہے''۔

حیا ایک ایسی صفت ہے جس کی وجہ سے انسان بڑے سے بڑے رذائل سے بچ جاتا ہے۔ جب تم دیکھو کہ آدمی ایسا کام جو شایانِ شان نہیں' کرنے سے جھجکتا ہے یا شرمندگی سے اس کے چہرے پر سرخی آ جاتی ہے تو سمجھ لو کہ اس کا ضمیر زندہ ہے۔ جب کسی کو دیکھو کہ کسی شر اور گناہ کے ارتکاب کی کوئی پرواہ نہ کرتا ہو اور نہ کسی فعلِ بد کے کرنے سے اس پر ندامت کے آثار ظاہر ہوتے ہوں تو سمجھ لو کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جس میں کوئی بھلائی نہیں۔ چنانچہ نبی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

اِذَا فَاتَکَ الْحَیَاءُ فَافْعَلْ مَا شِئْتَ

''یعنی جب تو حیا کو کھو دے تو جو مرضی میں آئے' کر''۔

ایمان بندوں اور پروردگار کے درمیان ایک لطیف تعلق ہے۔ اس کا سب سے پہلا اثر تزکیۂ نفس' اعمال اور اخلاق کی درستی ہے۔ ان چیزوں کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک نفس میں ایک زندہ جذبہ نہ ہو جس کی بنا پر انسان غلطیوں سے بچا رہے اور فضول باتوں سے کراہت محسوس کرے۔ بلا جھجک حقیر چیزوں میں پڑ جانا اور صغیرہ گناہوں کی پرواہ نہ کرنا حیا کے فقدان سے ہوتا ہے اور ایمان کے فقدان کی دلیل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''حیا اور ایمان ساتھ ساتھ ہیں۔ جب ایک اُٹھ جاتا ہے تو دوسرا بھی اُٹھ جاتا ہے''۔

جب انسان اپنی حیا کو گم کر دیتا ہے تو وہ ایک وحشی درندے کی مانند ہو جاتا ہے' اپنی خواہشات کے پیچھے دوڑتا ہے اور اس کی راہ میں اچھے سے اچھے جذبات کو روندتا ہے۔ وہ غریبوں کا مال غصب کرتا ہے اور اپنے دل میں رحم نہیں پاتا۔ مخلوقِ خدا کو مصائب میں دیکھتا ہے اور اس پر اثر

تک نہیں ہوتا۔اس کی خود پرستی نے اس کی آنکھوں پر تاریک پردہ ڈال رکھا ہے۔جو انسان اس پستی تک پہنچ جائے تو سمجھ لو کہ وہ انسانیت کی حدود سے باہر ہو گیا ہے۔

حیا کا تقاضا ہے کہ اِنسان اپنے منہ کو فحش باتوں سے پاک رکھے۔بے حیائی کی بات زبان پر نہ لائے اور بری باتوں کے اظہار سے شرمائے۔یہ بے ادبی کی بات ہے کہ انسان کی زبان سے فحش الفاظ نکلیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

''حیا ایمان سے ہے اور ایمان جنت میں ہے' اور فحش گوئی جفا سے ہے اور جفا دوزخ میں ہے''۔

بعض حکماء نے حیا کے تین مراتب لکھے ہیں:

1- احکام واوامر الٰہی کی پابندی اور اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں سے بچنا' نفسانی خواہشوں پر قابو رکھنا اور موت کو یاد کر کے بری خواہشات سے اجتناب کرنا۔

2- لوگوں کی ایذاء رسانی سے باز رہنا۔

3- خود اِنسان کا تنہائی میں اپنے آپ سے حیا کرنا اور ہر حالت میں خدا کو حاضر سمجھ کر تمام گناہوں سے بچنا۔

جس شخص نے حیا کے یہ تین مراتب حاصل کر لیے اس کے اندر تمام محاسن اور خوبیاں جمع ہو گئیں۔وہ اخلاقِ فاضلہ کا بہترین نمونہ ثابت ہو گا۔

حیا بھلائی کی جڑ ہے اور ہر عملِ خیر میں حیا کا عنصر ہوتا ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلم نے فرمایا ہے:

''فحش جس چیز کے ساتھ لگتا ہے' اسے عیب دار کر دیتا ہے اور حیا جس چیز کے ساتھ لگتی ہے اسے زینت دے دیتی ہے''۔

یہ امر بھی حیا سے ہے کہ انسان اپنے ساتھ رہنے والوں کے حقوق و مراتب پہچانے' اور صاحبِ فضل سے اس کے علم و فضل کا احترام کرتے ہوئے ملے۔اس کی آواز سے آواز بلند نہ کرے اور نہ اس سے آگے قدم بڑھائے۔حدیث میں ہے:

''جن سے سیکھو اُن کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ''۔

نیز حدیث میں یہ بھی آیا ہے:

''اے اللہ میں اس زمانے تک زندہ نہ رہوں کہ جس زمانے میں اہلِ علم کا اتباع نہ کیا جائے اور بردبار سے حیا نہ کی جائے''۔

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلم نے فرمایا:

''اللہ سے پوری پوری حیا رکھو'' ہم نے کہا:''یا رسولؐ اللہ! ہم تو پوری پوری حیا کرتے ہیں''۔آپؐ نے فرمایا:''بات یہ نہیں ہے۔اللہ سے کما حقہٗ حیا کرنا یہ ہے کہ سر کی حفاظت کرو اور جو کچھ اس نے محفوظ رکھا ہے اور پیٹ کی حفاظت کرو اور جو کچھ اس نے محفوظ رکھا ہے اور موت اور بڑھاپے کا خیال رکھو۔دیکھو جس کا مطمحِ نظر آخرت ہو گی وہ حیاتِ دنیوی کی زینت کو چھوڑ دے گا (یعنی مقصد نہیں بنائے گا) اور آخرت کو دُنیا پر ترجیح دے گا۔تو جس نے ایسا کیا اس نے اللہ سے پوری پوری حیا رکھی''۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے زیادہ عفت و حیا کے پیکر تھے اور فحش باتوں سے آپؐ کو طبعی نفرت تھی۔ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلم پردہ نشین با حیا عورت سے بھی زیادہ حیا دار تھے اور جب کوئی ناپسند چیز دیکھتے تو ہمیں اس کا احساس آپؐ کے چہرے سے ہو جاتا۔(یعنی حیا کی وجہ سے اس کی ناپسندیدگی کا اعلان نہ فرماتے بلکہ چہرہ ہی آپؐ کی قلبی کیفیت کا اظہار کر دیتا)۔

۹۔ سماجی اِنصاف

سماجی انصاف کے معنی ہیں: انسانی معاشرے میں انصاف......یعنی افرادِ معاشرہ میں بحیثیت انسان مساوات ہو اور ہر ایک کو اپنے حقوق حاصل ہوں۔ کسی ملک میں سماجی انصاف کا جائزہ لینے کے لیے درج ذیل اُمور کا دیکھنا ضروری ہے:

1- کیا وہاں کے معاشرے میں تمام انسان بحیثیت انسان برابر ہیں؟ یعنی کسی کو کسی طبقے، خاندان، قوم یا علاقے سے تعلق رکھنے کی بنا پر فضیلت تو حاصل نہیں؟

2- کیا وہاں کے معاشرے میں قانونی مساوات موجود ہے؟ یعنی کیا قانون کے سامنے سب برابر ہیں اور قانون کو سب پر بالادستی حاصل ہے؟

3- کیا وہاں کے معاشرے میں معاشی اور اقتصادی مساوات موجود ہے؟ یعنی کیا ہر ایک کی بنیادی ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں؟ اور کیا ہر ایک کو اپنی صلاحیت کے مطابق کام اور کام کا معقول معاوضہ مل رہا ہے؟ ایسا مثالی معاشرہ جس میں مکمل سماجی انصاف حاصل ہو، آج کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ اہلِ مغرب ہوں یا اہلِ مشرق، کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہمارے ہاں سماجی انصاف پورے طور پر موجود ہے۔

مسلمانوں کا ابتدائی دور مثالی معاشرے کا نمونہ پیش کرتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں انسانی مساوات، قانونی مساوات اور معاشی مساوات اپنے صحیح مفہوم میں موجود تھی۔

انسانی مساوات کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ (الحجرات 13:49)

ترجمہ: ''اے لوگو! بے شک ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم نے تمھیں خاندانوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بے شک اللہ کے ہاں تم میں سے زیادہ عزت والا ہے وہ جو زیادہ پرہیزگار ہے''۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم نے اسی حقیقت کو اپنے خطبہ حجتہ الوداع میں یوں بیان فرمایا:

اَيُّهَا النَّاسُ: اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَّاِنَّ اَبَاكُمْ وَاحِدٌ. كُلُّكُمْ لِاٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ. وَاِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقٰكُمْ لَيْسَ لِعَرَبِيٍّ فَضْلٌ عَلٰى عَجَمِيٍّ، وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰى اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى.

ترجمہ: اے لوگو بے شک تمھارا ربّ ایک ہے اور تمھارا باپ ایک ہے۔ تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے۔ تم میں سے اللہ کے ہاں زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہے۔ کسی عربی کو عجمی پر، کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر سوائے تقویٰ کے کوئی فضیلت حاصل نہیں''۔

انسانی مساوات پر اس سے زیادہ واضح بیان انسان کی پوری تاریخ میں نہیں ملتا۔ ہم نسلِ انسانی کی مساوات پر صرف آپؐ کے

ارشادات ہی نہیں پاتے، بلکہ عملی زندگی میں اس کی ہزاروں مثالیں دیکھتے ہیں۔

آپؐ نے فتح مکہ کے دن جو خطبہ دیا اس میں قوم کو یہی فرمایا کہ اللہ نے تمھارے جاہلیت کے غرور اور خاندانی افتخار کو ختم کر دیا ہے۔ تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا ہوئے۔ اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ بلال حبشیؓ، صہیب رومیؓ اور سلمان فارسیؓ صحابہؓ میں ممتاز مقام رکھتے تھے اور کسی شخص کو اس لیے افضل نہیں سمجھا جاتا تھا کہ وہ فلاں خاندان یا قبیلے یا علاقے کا ہے۔

2- قانونی مساوات

اسلام قانون کی بالادستی اور اللہ کے قانون کے سامنے افراد معاشرہ کی مساوات کا قائل ہے۔ قانون میں جو رعایت یا سزا کسی ایک کے لیے مقرر ہے، اس میں امیر و غریب، افسر و ماتحت اور چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ خود شارع علیہ السلام بھی اپنے آپ کو قانونِ الٰہی سے بالا نہیں سمجھتے بلکہ تمام احکام کی پوری پابندی فرماتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ اگر کسی نے مجھ سے بدلہ لینا ہو یا کسی کا میں نے کچھ دینا ہو تو حاضر ہوں۔ خلفائے راشدین کا دور بھی قانونی مساوات کا دور ہے جس میں عدل و انصاف کو ہر قیمت پر قائم رکھا جاتا تھا۔ عدل کے عنوان کے تحت اس موضوع پر لکھا جا چکا ہے۔ یہاں زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔

3- معاشی مساوات

اسلام معاشی مساوات کا علمبردار ہے۔ معاشی مساوات کے معنی یہ ہیں کہ معاشرے میں ہر فرد کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوں اور ہر ایک کو یکساں وسائلِ معاش اور روزی کمانے کے مواقع حاصل ہوں۔ کوئی شخص بنیادی ضرورتوں سے محروم نہ ہو اور ہر ایک کو کام اور محنت کا معقول معاوضہ مل رہا ہو۔

اس سلسلے میں اسلام کی تعلیمات بڑی واضح اور مکمل ہیں۔

اسلام نے اپنے مالی نظام کو اعتقادات، عبادات، معاملات اور اخلاقیات سے جدا کر کے پیش نہیں کیا، بلکہ ہر عمل کو جس میں خدا کی خوشنودی اور نوع انسانی کی بہتری ہو عبادت قرار دیا ہے۔ اسلام کی نظر میں جائز ذرائع سے مال و دولت حاصل کرنا اور اس کے ذریعے اپنی بنیادی ضرورتیں پوری کرنا اور غربت و افلاس کا خاتمہ کرنا قابل تعریف کام ہے اور بہت بڑی نیکی ہے۔

جہاں جائز کام اور محنت کے ذریعے روزی کمانا اسلام ضروری قرار دیتا ہے وہاں کسی بے روزگار اور معذور کے لیے بنیادی ضرورتوں کا فراہم کرنا حکومت اور سوسائٹی کا فرض سمجھتا ہے۔ اسلام اگرچہ انفرادی ملکیت کا قائل ہے مگر ایسی دولت جو ناجائز ذرائع سے حاصل ہوا سے حلال نہیں سمجھتا۔ اسی طرح جب وہ دولت ایک حد سے بڑھ جائے تو زکوٰۃ کی ادائیگی واجب کر دیتا ہے اور زکوٰۃ کے علاوہ بوقت ضرورت حکومت کو یہ حق دیتا ہے کہ مزید ٹیکس لگا کر تمام افراد مملکت کی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کی ذمہ داری نبھائے۔ اسلام اپنے معاشی نظام کی بنیاد درج ذیل حقائق پر رکھتا ہے:

1- کائنات کی ہر چیز اللہ کی ملکیت ہے اور حقیقی حاکم اور مالک اللہ ہے۔ جو کچھ کسی کے پاس ہے وہ اللہ کی امانت ہے اور اس میں اللہ کے احکام کی روشنی ہی میں تصرف کا حق ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لِلّٰہِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ (البقرۃ 284:2)

''جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اللہ کا ہے''۔

2- اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی ہر چیز کو بنی نوع انسان کی خاطر مسخر کیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّافِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاہِرَۃً وَّبَاطِنَۃً ؕ

(لقمٰن: 20:31)

''کیا تمھیں یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مسخر کر رکھا ہے تمھاری خاطر جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اس نے تمھیں اپنی ظاہری اور چھپی ہوئی نعمتیں بھرپور دے رکھی ہیں''۔

3- اللہ تعالیٰ نے رزق کی تنگی اور فراخی مصلحت کے تحت اور انسان کی آزمائش کی خاطر اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔

قرآن کریم میں اسی حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

وَھُوَالَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَا اٰتٰکُمْ ؕ

(الانعام: 165:6)

ترجمہ: ''اور (اللہ) وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں نائب بنایا اور تم میں سے ایک کو دوسرے پر درجوں میں بلندی دی تاکہ جو کچھ عطا کیا اس میں تمھیں آزمائے۔''

4- جنھیں رزق میں فراخی عطا کی گئی ہے ان کا فرض ہے کہ وہ مفلس اور محتاج لوگوں کی مدد کریں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَفِیْٓ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ. (الذّٰریٰت: 19:51)

''ان کے مال میں ضرورت مند سائل اور محروم کا حق ہے''۔

5- اسلام جائز وسائل سے کمائی ہوئی دولت میں حق ملکیت تسلیم کرتا ہے اور جب وہ دولت ایک حد سے بڑھ جائے تو اس پر زکوٰۃ عائد کرتا ہے۔ زکوٰۃ نقدی، مالِ تجارت، سونا چاندی اور مویشیوں پر عائد ہوتی ہے اور عُشر وغیرہ زمین کی فصل اور غلے پر عائد ہوتا ہے تاکہ حکومت عُشر اور زکوٰۃ کی آمدنی سے رعایا کے حقوق ادا کرے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی میں سستی یا نافرمانی کو برداشت نہیں کیا جاتا۔

خدا کا فرمان: اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ: ''نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو''۔ اس پر شاہد ہے۔

6- اگر حکومت کو ضرورت پیش آئے تو وہ اغنیاء پر زکوٰۃ کے علاوہ اور ٹیکس بھی لگا سکتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ فِی الْمَالِ حَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃِ.

''بے شک مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے''۔

7- وہ اشیاء جن سے مفادِ عامہ وابستہ ہو کسی فردِ واحد کی ملکیت نہیں بلکہ حکومت کی ملکیت ہوتی ہیں اور حکومت کو اللہ کے احکام کی روشنی میں ان میں تصرف کا حق ہوتا ہے۔ سمندر، دریا، پہاڑ، جنگلات اور معدنیات وغیرہ پر اسلام براہ راست حکومت کا قبضہ تسلیم کرتا ہے۔

8- ہر شخص کی بنیادی ضرورتیں پوری کرنا اور اسے اس کی صلاحیت کے مطابق ذریعہ معاش مہیا کرنا حکومت کا فرض ہے۔ اگر کوئی شخص ضروریاتِ زندگی سے محروم ہو کر وقت گزار رہا ہے تو اس کے بارے میں اہلِ محلّہ اور حکومت کے ارکان اللہ کے ہاں جوابدہ ہوں گے۔ آپؐ کا فرمان ہے:

''جس بستی میں کسی شخص نے اس حالت میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا' اس بستی والوں سے اللہ تعالیٰ کی حفاظت کا ذمہ ختم ہو جاتا ہے''۔

9- اسلام دولت جمع کرنے کے مقابلے میں اچھے کاموں پر دولت خرچ کرنے کو پسند کرتا ہے اور ارتکاز دولت کی جگہ دولت کی تقسیم پر زور دیتا ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ قرآن کریم کا ایک مستقل عنوان ہے۔ مال پر زکوٰۃ کی ادائیگی تو فرض ہے اس کے علاوہ ضرورت سے زیادہ مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دینا بہت بڑی نیکی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۵ ط قُلِ الْعَفْوَ ط (البقرة:2:219)

''وہ تم سے سوال کرتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں۔ کہہ دیجئے کہ جو کچھ ضرورت سے زائد ہو''۔

اگر انسان اللہ کے اس فرمان پر عمل کرے تو دُنیا میں کوئی شخص بنیادی ضرورتوں سے محروم نہ ہو اور اونچ نیچ ختم ہو جائے۔

الغرض اسلام اپنے معاشی نظام کی بنیاد ان حقائق پر رکھتا ہے جن کی موجودگی میں کوئی شخص معاشی ناانصافی کا شکار نہیں ہوتا۔ یوں اسلام ہر قسم کے سماجی انصاف کی ضمانت دیتا ہے۔

10۔ فرض شناسی

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین جسمانی قوتوں اور ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ سرتاج کائنات اور اشرف المخلوقات بنا کر زمین پر خلافت کی نعمت بخشی۔ پھر انسان کے لیے سب موجوداتِ عالم کو مسخر کیا۔ اس کی روزی کے لیے زمین پر مختلف غذائی اجناس پیدا کیں۔ زمین سے غلے اور میوے اگائے۔ آسمان سے زمینی پیداوار اگانے اور بڑھانے کے لیے بارش کا انتظام فرمایا۔ پیداوار کو حرارت اور روشنی بخشنے کے لیے سورج پیدا کیا۔ اس طرح تمام کائنات کو یعنی جمادات' نباتات اور حیوانات سے لے کر آفتاب' ماہتاب اور ستاروں تک انسان کی خدمت میں سرگرمِ عمل اور مصروفِ خدمت بنا دیا۔

انسان نفسیاتی طور پر اپنے ہم جنسوں سے ایک خاص اُنس و محبت رکھتا ہے۔ ان کے لیے اپنے اندر ایک گہری کشش پاتا ہے ان کی ہم نشینی میں ایک فرحت بخش سکون محسوس کرتا ہے۔ ان سے یکسر علیحدگی اسے بے چین کر دیتی ہے اور مسلسل یا طویل تنہائی وحشت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ علاوہ ازیں ایک طرف تو انسان کی ذاتی اور انفرادی قوتیں حد درجہ محدود ہیں' دوسری طرف ان کے مقابلے میں اس کی دنیوی ضروریات حد درجہ زیادہ اور وسیع ہیں۔ جن ضرورتوں کو بالکل بنیادی اور ناگزیر ضرورتیں کہا جاتا ہے' ان کا پورا کر لینا اس کے لیے اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ دوسرے بہت سے لوگ اس کی مدد نہ کریں۔ اس طرح وہ دنیوی زندگی گزارنے میں بہت سے اشخاص اور بہت سی چیزوں سے فائدہ حاصل کرتا ہے۔

اللّٰہ تعالیٰ نے جس طرح اس کو یہ حق دیا ہے کہ وہ دوسرے افراد کی محبت‘ محنت‘ ہمدردی اور تعاون سے فائدہ اٹھائے اور خدا کی پیدا کی ہوئی بہت سی چیزوں کو اپنے کام میں لائے‘ اسی طرح اس پر یہ بھی پابندی ہے کہ وہ دیگر افراد کی جان‘ مال اور آبروؤں کا بھی خیال رکھے اور معاشرہ جو فرائض اس پر عائد کرتا ہے انھیں خوش اسلوبی سے نبھائے۔فرض کا پورا پورا احساس رکھنا فرض شناسی کہلاتا ہے۔

ہر انسان پر تین قسم کے فرائض اور ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

1- حقوق اللہ

2- حقوق النفس

3- حقوق العباد

حقوق اللہ:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذّٰریٰت:56:51)

ترجمہ: اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔

خُدا کی عبادت انسان کا سب سے بڑا فرض ہے اور اسے پورا کرنا اس کے ذمے لازم ہے۔ یہ صرف اللہ ہی کا حق ہے کہ بندے اسی کو حاکم اعلیٰ مانیں۔اسی کے آگے اعترافِ بندگی میں سر جھکائیں۔اسی کی طرف اپنی حاجتوں میں رجوع کریں۔اسی کو مدد کے لیے پکاریں۔ اسی پر بھروسہ کریں۔اسی سے امیدیں وابستہ کریں اور اسی سے ظاہر و باطن میں ڈریں۔اسی طرح مالک الملک ہونے کی حیثیت سے یہ منصب بھی اللہ ہی کا ہے کہ اپنی رعیت کے لیے حلال وحرام کے حدود مقرر کرے۔ان کے فرائض وحقوق معین کرے۔ان کو امر و نہی کے احکام دے اور انھیں یہ بتائے کہ اس کی دی ہوئی قوتوں اور اس کے بخشے ہوئے وسائل کو وہ کس طرح کن کاموں میں کن مقاصد کے لیے استعمال کریں۔ یہ صرف اللہ کا حق ہے کہ بندے اس کی حاکمیت تسلیم کریں‘ اس کے حکم کو منبعِ قانون مانیں اور اسی کو امر و نہی کا مختار سمجھیں۔ اپنی زندگی کے معاملات میں اسی کے فرمان کو فیصلہ کن مانیں اور ہدایت و رہنمائی کے لیے اسی کی طرف رجوع کریں۔ جو شخص خدا کی ان صفات میں سے کسی صفت کو بھی کسی دوسرے کی طرف منسوب کرتا ہے اور اس کے ان حقوق میں سے کوئی ایک حق بھی کسی دوسرے کو دیتا ہے وہ دراصل اسے خدا کا مدمقابل اور ہمسر بناتا ہے جو کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔

حقوق النفس:

ہر انسان پر یہ فرض ہے کہ وہ زندگی کو نعمت خداوندی سمجھے اور خداداد جسمانی‘ ذہنی‘ روحانی اور نفسیاتی قوتوں کو تباہی سے بچانے کی کوشش کرے۔اسلام میں نہ تو خواہشات و جذبات کی بیخ کنی مطلوب ہے اور نہ ہوائے نفسانی میں ڈوبے رہنے کو پسندیدہ کہا گیا ہے بلکہ حیوانی جذبات کو شریعت کے احکام کے تحت رکھ کر اعتدال کی زندگی کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔اس لیے شریعتِ اسلامی میں خودکشی کرنے والا قاتل قرار دیا جاتا ہے اور دُنیا سے فرار اختیار کرنے والا راہب تصور ہوتا ہے اور رہبانیت اسلام کے منافی ہے۔

اسلام کی نظر میں ایک مضبوط اور طاقتور مسلمان ایک کمزور مسلمان سے بہتر ہے۔ اس لیے مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ مناسب خوراک کھائے، مناسب کپڑے پہنے اور مناسب گھر میں رہے اور بیمار ہونے کی صورت میں فوراً علاج کرائے۔

انسان کے ذمے اپنے نفس کا اہم حق یہ ہے کہ وہ اس کی عزت اور وقار کا خیال رکھے اور دوسروں کے سامنے دامنِ سوال پھیلا کر خیرات نہ مانگے کیونکہ اس قسم کی حرکتوں سے عزتِ نفس کو نقصان پہنچتا ہے۔

الغرض اسلامی شریعت میں نفس کی جائز خواہشات کی تکمیل ضروری ہے اور نفس کے حقوق کو صحیح طریقے سے ادا کرنا فرض شناسی ہے۔ نبی کریمؐ کا ارشاد ہے: وَلِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقٌّ : ترجمہ ''تم پر اپنے نفس (جان) کا حق ہے۔'' معلوم ہوا کہ نفس کے بھی حقوق ہیں جن کا ادا کرنا ضروری ہے۔

حقوق العباد:

ہر انسان پر دوسروں کے کچھ حقوق ہیں۔ معاشرتی زندگی میں ایک انسان کے حقوق دوسرے کے فرائض اور ایک کے فرائض دوسرے کے حقوق ہیں اور معاشرے میں ہر ایک انسان مختلف حیثیتوں سے اپنے فرائض انجام دے رہا ہے۔ مثلاً:

ایک مسلمان شہری کی حیثیت سے اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے دوسرے ابنائے وطن اور مسلمان بھائیوں کے مالوں، جانوں اور آبروؤں کا محافظ بن کر زندگی بسر کرے اور دوسروں کو اپنے ہاتھ اور زبان سے کسی قسم کی اذیت نہ پہنچائے اور جو چیز اپنے لیے پسند کرے وہی دوسروں کے لیے پسند کرے۔ نبی کریمؐ کا ارشاد ہے:

(i) مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان امن میں رہیں۔

(ii) تم میں سے کوئی اس وقت تک مکمل مسلمان نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی چیز پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

ایک معلّم یا معلّمہ کی حیثیت سے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ علم کا پیاسا، بااخلاق اور باعمل ہو اور نہایت ایمانداری کے ساتھ اپنے شاگردوں کو پڑھائے۔ وہ یہ محسوس کرے کہ وہ وارثِ انبیاء کی حیثیت سے یہ خدمت انجام دے رہا ہے۔ ایک طالبِ علم کی حیثیت سے اسے چاہیے کہ حاضر باش، فرمانبردار، استادوں کا احترام کرنے والا اور نیک سیرت ہو۔

ایک باپ کی حیثیت سے اس پر بچوں کی جسمانی پرورش، مقدور بھر کھانا، کپڑے اور مکان مہیا کرنا لازم ہے مگر اسے یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ صرف جسمانی پرورش سے عہدہ برآ ہو کر فرضِ منصبی پورا نہیں ہوتا بلکہ اولاد کی روحانی اور اخلاقی تربیت کا بھی پورا پورا انتظام کرنا اس کے ذمے ہے۔

ایک بیٹے یا بیٹی کی حیثیت سے اس پر والدین کا احترام فرض ہے۔ بڑھاپے میں بالخصوص ان کی خدمت کرے اور مرنے کے بعد ان کے لیے مغفرت کی دُعا مانگے۔

ایک شوہر کی حیثیت سے اس کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ اس کی خوراک، لباس، مکان اور دوسری ضروریاتِ زندگی کا پورا پورا خیال رکھے۔

ایک بیوی کی حیثیت سے اپنے شوہر کا حکم مانے اور اس کی غیر موجودگی میں گھر کی حفاظت کرے۔ شوہر جس آدمی کو ناپسند کرتا ہو اس کو گھر آنے کی اجازت نہ دے۔ بچوں کی پرورش کرے اور ان کو ماماتا سے محروم نہ رکھے۔

ایک بزرگ کی حیثیت سے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ چھوٹوں پر رحم کرے۔

اور ایک چھوٹے کی حیثیت سے اپنے بزرگوں کا احترام کرے۔

ایک پڑوسی کی حیثیت سے اپنے پڑوسی کی مقدور بھر مدد کرے۔

ایک مجاہد کی حیثیت سے دینِ اسلام کے دشمنوں کے خلاف جہاد کرے۔

ایک حاکم کی حیثیت سے اپنی رعیت کا خیال رکھے اور اپنے آپ کو مالک وآقا نہیں بلکہ خادم اور غلام سمجھ کر عدل وانصاف کرے۔

ایک دکاندار کی حیثیت سے ناپ تول اور لین دین میں عدل وانصاف سے کام لے اور ذخیرہ اندوزی، چور بازاری اور ناجائز ذریعوں سے دوسروں کا مال نہ کھائے۔

ایک ڈاکٹر یا انجینئر یا سرکاری ملازم کی حیثیت سے اپنا فرضِ منصبی ایمانداری کے ساتھ ادا کرے اور چند پیسوں کی خاطر ملک وقوم کو تباہ نہ کرے اور یہ سمجھے کہ ناجائز ذرائع سے حاصل کردہ مال آخرت میں اس کے لیے عذاب کا باعث بنے گا۔

انسانوں کے علاوہ مسلمان پر خدا کی دوسری ذی روح مخلوقات جن سے یہ دُنیا میں فائدے اٹھا رہا ہے، کے بھی حقوق ہیں۔ اسے چاہیے کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

اسلام نے حقوق العباد کو دوسرے فرائض پر ترجیح دی ہے مثلاً ایک آدمی نماز پڑھ رہا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ ایک اندھے آدمی کے کنویں میں گرنے کا خطرہ ہے تو اس کا یہ فرض ہے کہ وہ نماز کو چھوڑ کر اس اندھے کی زندگی بچائے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو یقیناً گناہ گار تصور کیا جائے گا۔ غرض خدا اگر چاہے تو اپنے حقوق بندے کو معاف کر دیتا ہے لیکن ایک بندے کا حق دوسرے بندے کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ اس لیے ہمیں دنیوی زندگی میں بندوں کے حقوق کا پورا پورا خیال رکھنا ہوگا ورنہ دین ودُنیا دونوں میں نقصان کا اندیشہ ہے۔

مختصر یہ کہ وہ فرائض جو انسان پر اس کے نفس، بنی نوع انسان اور اللہ سے تعلق کی بنا پر عائد ہوئے ہیں ان کو احسن طریقے سے ٹھیک ٹھیک انجام دینا فرض شناسی ہے۔ اسی پر دُنیا اور آخرت کی کامیابی کا انحصار ہے۔

۱۱۔ اسلامی عبادات کی امتیازی خصوصیات

کائنات کی تمام اشیاء انسان کے فائدے کے لیے بنائی گئی ہیں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

هُوَالَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ق (البقرة 2:29)

ترجمہ: ''اللہ وہ ذات ہے جس نے تمھارے لیے زمین کی تمام چیزیں بنائیں''۔

لیکن سوال یہ ہے کہ خود انسان کس مقصد کے لیے بنایا گیا ہے۔ قرآن پاک اس کا جواب یوں دیتا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذّٰریٰت:56:51)

''میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت (اطاعت) کریں''۔

انسان کو دُنیا میں سلطنت کرنے' مال و دولت کمانے' علوم وفنون میں مہارت حاصل کرنے اور دُنیا کی تمام نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کی اجازت ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اپنے منعمِ حقیقی کے سامنے گردن جھکانا' اور اسکی نعمتوں کا عملی شکریہ ادا کرنا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ کھا پی کر زندگی گزارنے میں تو انسان اور حیوان تمام برابر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانیت کا کمال روحانیت کے بغیر ناممکن ہے اور روحانیت کا ارتقاء عبادتوں ہی سے ہوسکتا ہے۔ کیونکہ روحِ انسانی کی غذا عبادت ہے۔ جس طرح جسم مادی اشیاء سے پرورش پاتا ہے' اسی طرح روح کو عبادتوں سے تربیت اور تقویت حاصل ہوتی ہے۔

عبادت دراصل بندگی کو کہتے ہیں۔ عبد کے معنی ہیں بندہ' عابد بندگی کرنے والا اور معبود وہ ہستی ہے جس کی بندگی کی جائے۔ بندہ اور عبد اپنے آقا اور معبود کی اطاعت میں جو کچھ کرتا ہے وہ عبادت ہے۔ اس لیے ایک مسلمان اپنی نشست و برخاست' لین دین اور آپس کے تعلقات میں جو اچھا کام بھی خدا کی اطاعت کے جذبے سے کرے یا اس جذبے کے تحت کسی برے کام کو چھوڑ دے' تو یہ اس کی عبادت شمار کی جائے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی زندگی تمام تر عبادت ہے۔ یہاں تک کہ اگر اہل وعیال کی خدمت اللّٰہ کے حکم کی اطاعت کے تحت کی جائے تو یہ بھی عبادت ہے۔

زندگی کو اطاعتِ خداوندی کے جذبے کے تحت بسر کرنے کے لیے شریعت نے نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج چار عبادتیں ایسی مقرر کی ہیں جن کی مدد سے انسانی اعمال کے تمام شعبے منضبط ہو کر خدا کی اطاعت کے تحت آ جاتے ہیں۔ نماز سے ان اعمال کی تربیت مقصود ہے جن کا تعلق تنہا بندے اور خدا کے درمیان ہوتا ہے۔ زکوٰۃ سے ان اعمال کی مشق ہوتی ہے جن کا تعلق دوسرے انسانوں کے فائدے اور آرام سے ہے۔ روزے سے خدا کی راہ میں جسمانی اور جانی قربانی دینے اور نفس کو مادی خواہشات سے پاک رکھنے کی تربیت حاصل ہوتی ہے اور حج کے ذریعے جہاں دُنیائے اسلام کا آپس میں اخوت کا رشتہ قائم کرنا مقصود ہے' وہاں نفس کی اصلاح بھی مطلوب ہے۔

اسلامی عبادات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ خالص ایک خدا کے ساتھ مخصوص رہتی ہیں۔ ان میں اللّٰہ کے سوا کسی کی پرستش کا ادنیٰ شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ اسی لیے اسلام میں بادشاہ' والدین اور دوسرے بزرگوں کے سامنے جھکنا اور رکوع کرنا یا ان کے نام پر قربانی دینا اور دیگر وہ تمام رسمی آداب ممنوع ہیں جن سے غیر اللّٰہ کی پرستش کی بو آتی ہو۔

اسلام نے عبادات کے لیے ایسی خارجی شرط کوئی نہیں لگائی جس کا اصل عبادت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اس لیے یہاں نہ مسجدوں میں اگر بتی جلانے کی ضرورت ہے نہ عبادت کے وقت تصویروں کو سامنے رکھنے اور نہ کسی خاص رنگ یا خاص قسم کا لباس پہننے کی پابندی ہے۔

اسلام میں دوسرے مذاہب کی طرح مذہبی پیشواؤں کو خدا اور بندے کے درمیان واسطہ نہیں بنایا گیا۔ ہر شخص براہ راست اپنے خدا کی عبدات میں مصروف ہوسکتا ہے۔ عبادتیں ہر پاک جگہ پر ادا ہوسکتی ہیں۔

اسلامی عبادات میں افراط وتفریط کا شائبہ تک نہیں ہے۔ ان میں اعتدال ومیانہ روی کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان میں نہ تو بدھ مت اور عیسائیت کی طرح نفس کشی' ترکِ دُنیا اور سخت قسم کی ریاضتیں ہوتی ہیں اور نہ مشرکانہ طرز پر عبادت میں لہو ولعب کی اجازت ہے۔

اسلام سے پہلے لوگوں نے ایسے طریقے ایجاد کیے تھے جو منشاء الٰہی کے خلاف تھے۔ بعض عبادت گزاروں نے آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا دیئے اور اپنے آپ پر اس حد تک جبر کیا کہ بازو کھڑے کھڑے سوکھ گئے اور پرندوں نے ان پر گھونسلے بنا لیے۔ بعض نے سجدے کو اتنا طول دیا کہ جسم اسی حالت میں اکڑ گیا۔ بعض نے رکوع میں وہ غلو کیا کہ زندگی بھر اسی حالت میں کھڑے رہے۔ روزے رکھنے پر آئے تو جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ اس کی بڑی واضح مثال مہاتما بدھ ہیں جنھوں نے نروان حاصل کرنے کے لیے عبادت کی ایسی مثال پیش کی جس کی پیروی عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ یہی صورت مسیحی راہبوں میں بھی نظر آتی ہے۔

اسلامی عبادات ایسی چیزیں نہیں ہیں جو انسان کا رابطہ صرف اللہ سے قائم کر کے اسے بنی نوع انسان سے متنفر کر دیں۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج یہ سب کی سب انسان کو ایک ایسی زندگی کی طرف تیزی سے لیے جاتی ہیں جو فضائل اور اخلاقِ حسنہ سے آراستہ ہو۔ بہت سے مذاہب ایسے ہیں جو اس امر کی بشارت دیتے ہیں کہ کسی عقیدے کا معتقد ہو جانا ہی تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور دنیا و آخرت میں کامیابی کے لیے وہی عقیدہ کافی ہے مگر اسلام کہتا ہے کہ درست عقیدے کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ عقیدہ اچھے کاموں کا محور اور ادائے حقوق کا مرکز اور بھلائی کا رہبر ہو۔ صرف عقیدے سے کام نہیں بنتا بلکہ عملِ صالح کامرانی اور نجات کے لیے ضروری ہے۔

اسلامی عبادات کا یہ کمال ہے کہ وہ انسانوں کو حیوانیت سے نکال کر زیورِ انسانیت سے آراستہ کرتی ہیں۔ اسلامی عبادات کا مقصد جہاں اللہ کی عبادت اور اطاعت ہے وہاں تزکیۂ نفس بھی ہے۔ اگر انسان اسلامی عبادات کو اسلام کی ہدایات کی روشنی میں ادا کرے، تو جہاں وہ ایک مومنِ کامل بنتا ہے وہاں ایک مثالی انسان بھی بن کر نکلتا ہے جس پر معاشرہ فخر کر سکتا ہے۔

سوالات

1- عقیدۂ توحید کی وضاحت کیجیے۔
2- اطاعتِ رسولؐ اور اس کی اسلام میں اہمیت پر مختصر نوٹ لکھیے۔
3- طہارت کی قسمیں بیان کریں اور ہر ایک کی وضاحت کریں۔
4- اسلام میں علم حاصل کرنے کے لیے کیا ترغیبات دی گئی ہیں۔
5- اسلامی معاشرے میں سماجی انصاف پر کیوں زور دیا گیا ہے۔ وضاحت کریں۔
6- اسلامی عبادات کی امتیازی خصوصیات بیان کیجیے۔
7- اکلِ حلال پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔
8- انسانی کردار سازی میں عقیدۂ توحید کا کیا عمل دخل ہے؟ تفصیل سے لکھیں۔
9- جہاد کی اقسام اور فضائل بیان کیجیے۔
10- آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویؐ کی روشنی میں بے حیائی کی مذمت کیجیے۔
11- حقوق کی اقسام پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

باب چہارم

سیرتِ طیّبہ

افضل الرّسل صَلّی اللّٰہ علیہ واٰلہٖ وسَلّم

انسانیت کی سب سے بڑی اور مقدس خدمت یہ ہے کہ افکار، اخلاق اور اعمال کی اصلاح کی جائے اور ہر قسم کے اچھے اخلاق مثلاً تقویٰ، احسان، عفوو درگزر، عزم و استقلال، ایثار، غیرت، خدمتِ خلق وغیرہ کے اصول وضع کیے جائیں اور پھر تمام دُنیا میں ان کی عملی تعلیم کو رواج دیا جائے تاکہ انسانی کردار کی تعمیر ہو اور انسانیت کی ایک مکمل صورت وجود میں آئے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کا ایک عام طریقہ تو وعظ و نصیحت کا ہے۔ اس سے بہتر اور ترقی یافتہ طریقہ یہ ہے کہ اخلاق پر اعلیٰ درجے کی کتابیں لکھی جائیں اور مطالعہ کے لیے دُنیا میں ان کو پھیلا دیا جائے یا لوگوں سے اچھے اخلاق پر عمل کرایا جائے اور برے کاموں سے ان کو روکا جائے۔ اس ترقی یافتہ دور میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کیا جا سکتا لیکن ان سب طریقوں سے بڑھ کر صحیح، مکمل، جامع اور عملی طریقہ یہ ہے کہ کوئی شخص مجسمِ اخلاق بن کر ہمارے سامنے آ جائے۔ جس کے نیک عمل ہمارے لیے کامل نمونہ (اسوہ حسنہ) ہوں۔ وہ جو اچھی بات زبان سے کہتا ہو اس پر عمل کر کے اور اس کا نمونہ بن کر لوگوں کے سامنے موجود رہتا ہو۔ جس کی زبان میں اس قدر تاثیر ہو کہ ہر کوئی اس کے اخلاق کا گرویدہ ہو کر اس کی آواز پر لبیک کہے جس کے ظاہر اور باطن، گفتگو اور عمل میں کوئی فرق نہ ہو اور جس کے اخلاق و اعمال کی تصویر بن جانا انسان کے لیے باعثِ فخر ہو۔

ایسی جامع اخلاق اور پاکباز ہستیاں لوگوں کے اعمال و اخلاق کی اصلاح کے لیے انبیاؑ اور رسولوںؑ کی شکل میں دُنیا میں آتی رہی ہیں اور نوعِ انسانی کی اصلاح و تربیت کا فرض انجام دے کر رخصت ہوتی رہیں۔ ایسی ہی جامعِ کمالات ہستی ہمارے نبی اور رسول حضرت محمد صلی اللّٰہ علیہ واٰلہٖ وسلم ہیں جو تمام انبیاءؑ اور رسولوںؑ کے آخر میں تشریف لائے۔ آپؐ سے قبل حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت لوطؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور بہت سے دوسرے انبیاء (علیہم السلام) اپنے اپنے وقت کے حالات اور زمانے کی ضرورت کے مطابق دُنیا کی اصلاح و تربیت کے لیے تشریف لاتے رہے۔ ان سب کی تعلیم و تبلیغ اگرچہ ہر ایک کے اپنے وقت کی ضرورت کے مطابق مکمل اور کامل تھی لیکن ہر نئے دور اور ہر نئے زمانے کے لیے نئے نئے انبیاءؑ کی ضرورت پیش آتی رہی جو گزشتہ رسولوںؑ کی تعلیم کی تکمیل کے لیے حد درجہ ضروری تھا تا آنکہ آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ واٰلہٖ وسلم ایک کامل راہ نما کی حیثیت سے اس دُنیا میں تشریف لائے۔ آپؐ چونکہ ''خاتم الانبیا'' ہیں اور آپؐ کی نبوت اور آپؐ کی لائی ہوئی کتاب چونکہ قیامت تک کے لیے ہے اس لیے آپؐ کی ذات اقدس بھی گزشتہ تمام انبیاءؑ کی جامع ہے اور آپؐ ہر خوبی اور اچھائی کی معراج اور بلندی پر ہیں اور اللّٰہ کی کتاب یعنی قرآن عزیز

بھی آنحضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے قبل کے تمام انبیاءؑ کی تعلیم کا مرقّع ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی ذات اقدس ہی ایک جامع اور کامل ہستی ہے۔آپؐ دُنیا کے انسانوں کی اصلاح وتربیت کے لیے ان کے راہنما بن کر، خدا کے تمام پیغمبروں کے سردار کی حیثیت سے، آج سے کوئی چودہ سو برس پیشتر اس دُنیا میں تشریف لائے۔آپؐ کی تعلیمات کی سچائی اور آپؐ کی شخصیت کا کمال یہ ہے کہ آپؐ کی زبان کا ایک ایک حرف، آپؐ کی حرکات وسکنات کی ایک ایک ادا اور آپؐ کی زندگی کا ایک ایک خط وخال پوری طرح محفوظ ہے اور چونکہ اس فانی دُنیا کی کوئی چیز ابدی اور ہمیشہ رہنے والی نہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم بھی اس دُنیا میں آکر ہمیشہ نہ رہ سکتے تھے اس لیے اب آپؐ پر نازل شدہ قرآن کریم اور آپؐ کی پاکیزہ زندگی کا ایک ایک ورق ہمارے لیے راہنمائی کا کام دیتا ہے۔اب اگر یہ سوال کیا جائے کہ دُنیا میں وہ کون شخص گزرا ہے جس کی حیاتِ طیبہ اور زندگی کے ہر کارنامے کو حد درجہ احتیاط اور اتنی وسعت وتفصیل سے لکھا گیا کہ اقوال وافعال، وضع قطع، شکل وشباہت، رفتار وگفتار، مزاج وطبیعت، انداز گفتگو، طرز زندگی، رہنے سہنے، کھانے پینے، چلنے پھرنے، اُٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے اور ہنسنے بولنے کی ایک ایک ادا محفوظ رہ گئی ہو تو اس سوال کے جواب میں صرف اور صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ ''حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے تمام رسولوںؑ اور نبیوںؑ کے سردار ہونے کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ باقی انبیاء علیہم السلام کا اپنے اپنے دور میں دائرۂ تبلیغ محدود تھا مگر اس کے برعکس رسول کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم پوری انسانیت کے لیے تا قیامت ہادی بن کر تشریف لائے۔اسی بنا پر آپؐ کی تعلیمات انسانیت کی رہنمائی کے لیے کتاب وسنت کی شکل میں موجود ہیں اور مسلم اور غیر مسلم راہِ حق پانے اور اس پر گامزن رہنے کے لیے ان سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

رِسالت: مفہوم، منصب اور اُس کی عظمت

رِسالت گرامر کے لحاظ سے مصدر ہے جس کا لغوی معنی بھیجنا اور خط کتابت کرنا ہے۔اصطلاحِ شریعت میں اللہ تعالیٰ کا کسی برگزیدہ بندے کو انسانوں تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے بھیجنا رسالت کہلاتا ہے۔

رسالت:

توحید کے بعد قرآن حکیم نے جس عقیدے کی اصلاح کو ضروری سمجھا ہے وہ ''رسالت'' ہے۔کسی تعلیم کی اچھائی اور برائی میں معلم (تعلیم دینے والے) کی شخصیت کو بہت بڑا دخل ہوتا ہے کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ اچھی تعلیم کا معلم بدعمل انسان ہو یا بری تعلیم کا معلم نیکوکار ہو۔اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کے ساتھ ہم کلام نہیں ہوتا بلکہ وہ کسی خاص انسان کو ہم کلامی کے لیے چن لیتا ہے جو خدا کی جانب سے انسانوں کی ہدایت کا فرض انجام دیتا ہے۔

بشری کمالات سے متصف یہ انسان، نہ خدا ہوتا ہے اور نہ خدا کا بیٹا۔خدا سے ہم کلام ہونے کے باوجود وہ بشر اور انسان ہی رہتا

ہے مگر خدا کا پیامبر ہونے کی وجہ سے پاکی اور تقدس کا جو رشتہ اسے خدا کی درگاہ سے وابستہ کیے ہوئے ہے' اس کے پیش نظر اس کی ہستی کا انکار کفر ہے۔

رسولؐ اور نبیؐ اگرچہ ایک انسان ہوتا ہے لیکن اپنے منصب اور عقل وفکر کے لحاظ سے تمام انسانوں سے بہت بلند ہوتا ہے اور علم وعمل میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔

رسالت اور نبوت کا رتبہ سعی ومحنت سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ ''عطیۂ الٰہی'' ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ نبوت کا منصب کس کو عطا کرے۔ ''غور کیجیے کہ نوعِ انسان کو انسان اور فرشتوں کو فرشتہ کس نے بنایا؟ کیا ایسا بننے کے لیے انھوں نے کوئی محنت یا کوشش کی؟ نہیں بالکل نہیں' یہ سب اللہ تعالیٰ کی بخشش اور عطا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے بے پایاں فضل وکرم سے جسے چاہے رسالت اور نبوت سے سرفراز فرما دیتا ہے اور جنھیں نبوت ورسالت سے سرفراز کیا جاتا ہے وہ اپنے وقت کے تمام انسانوں سے افضل ہوتے ہیں۔

قرآن کا کہنا ہے کہ جب ہدایتِ انسانی کے لیے اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مخصوص فرما دیتا ہے اور رسالت ونبوت سے اسے سرفراز فرما دیتا ہے تو یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ انسان نے جب سے اس کائنات میں قدم رکھا ہے اسی وقت سے رشد وہدایت کا یہ سلسلہ جاری ہے اور کوئی گروہ یا جماعت ایسی نہیں جس میں خدا کا کوئی پیغامبر ان کی اصلاح وہدایت کے لیے نہ بھیجا گیا ہو اور کوئی ہادی یا راہنما ان میں نہ آیا ہو۔ اس بات پر ایمان رکھنا بھی ضروری ہے کہ جب خُدا ایک ہے اور اس کی تعلیم بھی ایک تو بلا شبہ تمام پیغمبرانِ خُدا کی بنیادی تعلیم بھی ایک ہی رہی ہے۔ اس لیے اگر خدا کے کسی ایک برحق نبیؐ ورسولؐ کا انکار کر دیا گیا تو گویا قرآن عزیز نے جو کچھ کہا اس کا بھی انکار کر دیا گیا۔

رسولؐ اور پیغمبر اپنے جن اوصاف سے پہچانا جاتا ہے وہی رسالت اور نبوت کے اوصاف' خصوصیات اور لوازم ہیں جو مختصراً یہ ہیں:

1- رسولؐ کے علم وہدایت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہے۔
2- وہ معصوم ہوتے ہیں اور ان کا کردار بے داغ ہوتا ہے۔ ان سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوسکتا۔
3- رسالت کا منصب محنت اور کوشش سے نہیں بلکہ خدا کی مرضی اور انتخاب سے ملتا ہے۔
4- رسولؐ کو انسانوں کی راہ نمائی وہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ضابطۂ حیات عطا کیا جاتا ہے' جس سے حق وباطل کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔
5- وہ تائید الٰہی سے سرفراز ہوتا ہے اور اسے چند ایسے نشان (معجزات) دیئے جاتے ہیں جو اس بات کی علامت ہوتے ہیں کہ وہ اللہ کا بھیجا ہوا ہے۔
6- رسولؐ کی پیروی سے لوگ نیکوکار اور صالح بنتے ہیں اور اس کی اطاعت ان تمام انسانوں پر واجب ہوتی ہے جن کی طرف وہ بھیجا جاتا ہے اس لیے رسولؐ کا منکر کافر ہے۔
7- اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی اور وحی الٰہی کے ذریعے مخلوق کی خیر خواہی اور صراطِ مستقیم کی طرف انسانوں کی راہنمائی رسولؐ کی زندگی کا مقصد ہوتا ہے۔

رسالت کی ضرورت اور اس کی اہمیت

رسولؐ اور نبیؑ کا کام انسانوں کی اصلاح ہے۔ وہ اس لیے کہ انسان جسے عقل، ارادہ، سوچنے اور سمجھنے کی قوت عطا کی گئی ہے، اپنے اعمال میں آزاد اور خودمختار ہے اور اسی سبب سے وہ اشرف المخلوقات کا مقام رکھتا ہے لیکن اگر انسان اپنے ارادے کی آزادی سے کام لے کر جو چاہے کرنے لگے تو معاشرے میں فساد اور بگاڑ پیدا ہونا لازمی ہے۔ ارادے کی اصلاح کے لیے دل کی اصلاح ضروری ہے۔ یہی وہ کام ہے جو نبیؑ اور رسولؐ انجام دیتا ہے۔

بظاہر نظر آتا ہے کہ اس قسم کے کچھ کام ایسے لوگوں سے انجام پاتے ہیں جو رسالت اور نبوت کے منصب پر فائز نہیں ہوتے۔ وہ قوم اور ملک کے سامنے اصلاح کی دعوت پیش کرتے ہیں۔ سعی و محنت اور متواتر جدوجہد سے ان میں سیاسی، تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی انقلاب پیدا کرتے اور انھیں پستی سے نکال کر اوجِ ترقی تک پہنچا دیتے ہیں۔ کوتاہ نظر لوگ ایسے لوگوں اور پیغمبروں میں کوئی امتیاز نہیں کرتے اور یہ نہیں سمجھ سکتے کہ ایک نبی اور مصلح میں کیا فرق ہے۔

مصلح یا ریفارمر اور ایک واعظ یا حکیم ظاہری اور مادی زندگی کی اصلاح تو شاید کر سکتا ہو لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوتا جو دلوں کی اصلاح کر کے ان میں نیکی اور بدی کی تمیز پیدا کر سکے یا انسان کے احساس و ارادہ کے اختیار کے قدم کو غلط روی سے روک سکے یا اپنی زبان، تعلیم و تلقین اور فیضِ صحبت سے انسانوں کے اخلاق و عادات، جذبات، ارادہ و اختیار حتیٰ کہ پورے دل کی قوتوں میں انقلاب برپا کر سکے۔

نبیؑ اور رسولؐ، یہ سب کام انجام دیتے ہیں۔ جہاں بڑے بڑے فلسفیوں اور حکیموں کی عقل حیران اور مجبور رہ جاتی ہے وہاں ایک رسولؐ اور نبیؑ وحی الٰہی کی راہنمائی میں انسانوں کی روحانی اور قلبی مشکلات کی عقدہ کشائی کرتا ہے۔ وہ کسی معلم اخلاق، بادشاہ، حکیم اور مصلح کی طرح صرف بازاروں، مجمعوں اور آبادیوں کا امن و اطمینان نہیں چاہتا بلکہ وہ لوگوں کے دلوں کے اندر کا امن و اطمینان چاہتا ہے۔ برے اخلاق کی بیخ کنی کرتا اور انسانوں کے اندر اچھے اخلاق کی تخم ریزی کرتا ہے۔ غلط رسم و رواج کو دور کرتا اور انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کر کے صرف خدا کا غلام بنا دیتا ہے۔ ربّ تعالیٰ فرماتے ہیں:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ
(الحدید 35:57)

ہم نے رسولوں کو کھلی ہدایت دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اتاری اور (عدل کی) ترازو تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم رہیں (اور امن و اطمینان کی زندگی بسر کریں)

نوعِ انسانی کے باقی تمام کارکن اور خادم اپنا فرض جس مقصد اور ارادے سے انجام دیتے ہیں اس کا دائرہ موجودہ زندگی کی بھلائی اور برائی سے آگے نہیں بڑھتا مگر انبیاؑ اور رسولؐ انسانوں کی خدمت کے یہ کام اس لحاظ سے کرتے ہیں کہ موجودہ زندگی کی بھلائی اور برائی کا اثر ان کی دوسری اور دائمی زندگی پر کیا پڑے گا۔ وہ جسم کی خدمت صرف جسم کے لیے نہیں بلکہ روح کے لیے کرتے ہیں اور مخلوق کی خدمت خالق کی مرضی کے مطابق بجا لاتے ہیں اور خالق کی خوشنودی کی خاطر ہی انسانوں کو انسانوں سے محبت اور بھائی چارے کا سبق دیتے ہیں۔

وہ صرف اچھی اور میٹھی باتیں لوگوں کو نہیں سناتے بلکہ خود بہتر سے بہتر عمل کر کے دوسروں کو بھی اس کا عامل بناتے ہیں۔ وہ اپنے دل سے جوڑ کر باتیں نہیں کرتے بلکہ خدا سے سن کر کہتے ہیں۔ وہ صرف کہتے ہی نہیں بلکہ جو کہتے ہیں وہ کرتے بھی ہیں۔

نبوت و رسالت کے علم کا منبع، ماخذ یا سر چشمہ تعلیمِ رَبانی اور وحی والہام ہوتا ہے تعلیمِ انسانی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ؐ کے متعلق فرمایا۔

وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰیO ؕ اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰیO ۙ (نجم 53:3-4)

''نبیؐ خواہشِ نفس سے کلام نہیں کرتا بلکہ وہ وحی ہوتی ہے جو اُسے کی جاتی ہے''۔

انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جب سے دُنیا میں قدم رکھتے ہیں اسی زمانے سے آنے والے وقت اور ملنے والے منصب کے آثار ان سے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ وہ حسب ونسب اور سیرت وصورت میں سب سے ممتاز ہوتے ہیں۔ شرک وکفر کے ماحول میں ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اس کی گندگی سے بچائے رکھتے ہیں۔ اخلاقِ حسنہ سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ان کی دیانت، امانت، سچائی اور راست گفتاری مسلّم ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ اسی لیے ہوتا ہے کہ جب وہ نبوت کا اعلان کریں تو لوگوں کے دل پہلے ہی سے اس کی تصدیق کے لیے تیار ہوں۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت داوٗدؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت یحییٰؑ، حضرت عیسیٰ (علیہم السلام) اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے اعلانِ نبوت سے قبل کے حالات اس کے گواہ ہیں۔

نبیؑ اور رسولؑ کا فرض اولین ہدایت اور راہ نمائی ہے چنانچہ نبیؑ کے لیے قرآن عزیز نے ''ہادی'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

وَلِکُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ (الرعد 13:7) ''ہر قوم کے لیے ایک راہ دکھانے والا آیا''

اور اس ضابطۂ حیات کو بھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو عطا کیا گیا ''ہدایت'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا جیسا کہ قرآن کے آغاز میں ہی فرما دیا:

ذٰلِکَ الۡکِتَابُ لَا رَیۡبَ فِیۡهِ هُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ

ہدایت اور راہ نمائی کا مفہوم یہ ہے کہ انبیاؑ اور رسول بندگانِ خُدا کو باطل کے اندھیرے سے نکال کر حق کی روشنی میں لاتے ہیں۔ انھیں شک کی جگہ یقین، جہل کی جگہ علم، باطل کی جگہ حق عطا کرتے ہیں۔

انبیاؑ اور رسولؑ جو مقصد لے کر دُنیا میں آتے ہیں خواہ کس قدر مشکلات پیش آئیں، کتنی ہی رکاوٹیں ہوں، کتنی ہی تکلیفوں اور زحمتوں کا سامنا ہو، بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔ پیغمبروں کی سیرت اور ان کی دعوت کی تاریخ خود اس پر گواہ ہے۔

''انبیاء علیہم السّلام کی تبلیغی مساعی''

تبلیغ کا مفہوم: تبلیغ کے لغوی معنی ہیں ''پہنچانا''۔ اسلام میں اس سے مراد اللّٰہ کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانا اور انھیں اس کے قبول کرنے کی دعوت دینا ہے۔

قرآن عزیز میں تبلیغ کے ہم معنی کچھ اور الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک لفظ ''تذکیر'' ہے جس کے معنی یاد دلانا اور نصیحت کرنا ہیں اور ایک لفظ ''انذار'' سے ہے جس کے معنی ڈرانا اور ہوشیار کرنا ہیں۔ اسی طرح کا لفظ ''دعوت'' ہے جس کا معنی بلانا ہے۔

اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے تبلیغ کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ قرآن عزیز میں اس کے لیے واضح حکم موجود ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ط اے رسولؐ پہنچا دیجیے جو کچھ تم پر تمھارے ربّ کی جانب سے نازل کیا گیا ہے۔ (المائدہ 67:5)

حکم خداوندی کی تعمیل میں آنحضور صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم نے اللہ کے ہر پیغام کو انسانوں تک پہنچانے کا حق ادا کیا ہے اور امت کے لیے عملی نمونہ باقی چھوڑا ہے۔

اگر چہ دیگر انبیاء علیہم السّلام کی بنیادی ذمہ داری عالمگیر تبلیغ نہ تھی تاہم جس جس قوم کی طرف انھیں نبی بنا کر بھیجا گیا تھا اس تک اللہ کا پیغام پہنچانے میں انھوں نے کوئی کمی نہ چھوڑی اور اس سلسلے میں ہر قسم کی مشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔

یہاں چند اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کی تبلیغی مساعی کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

حضرت نوح علیہ السّلام

آنحضور صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم سے ہزاروں سال پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو رسولؑ اور نبی لوگوں کی اصلاح کے لیے بھیجے گئے تھے ان میں سے حضرت آدمؑ کے بعد دُنیا کے بزرگ ترین نبی حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔

حضرت نوح علیہ السّلام نے اپنی قوم کو راہِ حق کی طرف بلایا اور سچے مذہب کی دعوت دی لیکن ان کی قوم نے ان کی ایک نہ سنی اور ان کی تعلیمات کو نفرت وحقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ قوم کے رئیسوں نے ان کی بھر پور مخالفت کی جو غریب لوگ ان پر ایمان لائے تھے ان سے بدسلوکی کی۔ وہ حضرت نوحؑ سے کہتے کہ انھیں اپنے پاس سے دور کر دے پھر ہم تیری بات سنیں گے۔ ہمیں ان سے گھن آتی ہے۔ ہم اور یہ ایک ساتھ نہیں بیٹھ سکتے۔ لیکن حضرت نوحؑ نے اللہ کے ان مخلص بندوں کو دور کرنا گوارا نہ کیا اور دولت مندوں کی ہنسی مذاق کو برداشت کرتے رہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے ہمیشہ کہا کہ ''مجھے نہ تمھارے مال و دولت کی ضرورت ہے اور نہ جاہ و منصب کی۔ میں تبلیغ کے عوض کسی اجرت کا طلبگار نہیں''۔ حضرت نوح علیہ السلام کی انتہائی کوشش کے باوجود ان کی بدبخت قوم راہ راست پر نہ آئی۔ وہ تبلیغ میں جتنی

سرگرمی دکھاتے اِتنا ہی انھیں اپنی قوم کی دشمنی کا سامنا کرنا پڑتا۔ قوم انھیں ایذائیں اور تکلیفیں دیتی رہی اور کہتی رہی کہ ''اے نوحؑ! ہم سے بحث مباحثہ نہ کر اور ہمارے اس انکار پر خُدا کا عذاب لا سکتا ہے تو لے آ۔''

حضرت نوح علیہ السلام جب قوم کی ہدایت سے بالکل مایوس ہو گئے اور ان کی ضد اور ہٹ دھرمی ان پر واضح ہو گئی اور عمر بھر کی تبلیغ کا ان پر کوئی اثر نہ دیکھا تو سخت رنجیدہ اور پریشان ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں تسلی دی اور کہا کہ وہ قوم کے اس رویے پر غم نہ کھائیں۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ ''اے اللہ! دُنیا سے کافروں کا نام ونشان مٹا دے۔'' ان کی یہ دُعا قبول ہوئی۔

چنانچہ زمین کا وہ خطہ جہاں نوحؑ اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے کے لیے بھیجے گئے تھے' پانی کے شدید طوفان کی لپیٹ میں آ گیا جو تاریخ میں ''طوفانِ نوح'' کے نام سے مشہور ہے۔

حضرت نوحؑ اور ان کے پیرو ایک بڑی کشتی کے ذریعے اس سیلاب سے محفوظ رہے۔ انھوں نے یہ کشتی اللہ تعالیٰ کے حکم سے بنائی تھی۔

حضرت نوحؑ خود' ان کے چالیس یا اسّی پیروؤں کی مختصر جماعت اور تمام جانداروں میں سے ہر ایک کا ایک ایک جوڑا اس کشتی میں پناہ گزین تھا۔

اسی ''طوفانِ نوح'' میں حضرت نوحؑ کا بیٹا (کنعان) بھی جو کافروں کا ساتھی تھا' ہلاک ہوا۔

پانی جب خشک ہوا تو ساکنانِ کشتی نے خدا کی زمین پر دوبارہ قدم رکھا اور انھی سے خدا کی زمین دوبارہ آباد ہوئی۔ اسی بنا پر حضرت نوحؑ کا لقب ''آدمِ ثانی'' یعنی انسانوں کا دوسرا باپ مشہور ہوا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے عظیم الشان نبی تھے۔ قرآن عزیز کی ہدایت کا پیغام چونکہ ملّت ابراہیمی کا پیغام ہے۔ اس لیے قرآن نے ان کے واقعات کو مختلف پیرایوں میں جگہ جگہ بیان کیا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ عراق کے قصبے ''اُور'' کے باشندے تھے۔ ان کا زمانۂ نبوت اندازاً دو ہزار سال قبل مسیح ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی قوم بت پرست بھی تھی اور ستارہ پرست بھی۔ وہ خود چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی قوم کی اصلاح کے لیے چن لیے گئے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ شرک کا سب سے بڑا مرکز خود ان کا اپنا گھر ہے اور ان کے باپ آذر کی بت سازی اور بت پرستی قوم کے لیے محور بنی ہوئی ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر آپؑ نے اللہ تعالیٰ کی تعلیم پہنچانے کا آغاز اپنے گھر سے کیا۔ آذر کو اسلام کی تلقین کی اور راہ مستقیم دکھائی لیکن اس پر آپؑ کی نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے حضرت ابراہیمؑ کو ڈرایا اور کہا کہ ''ابراہیم! اگر تو بتوں کی برائی سے باز نہ آئے گا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا''۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آذر کی سختی کا جواب سختی سے نہ دیا اور اس کی تحقیر اور تذلیل نہ کی بلکہ نرمی اور اخلاق کے ساتھ جواب دیا کہ ''جناب! اگر میری بات کا یہی جواب ہے تو آج سے خدا حافظ۔ میں خدا کے سچے دین اور اس کے پیغامِ حق کو نہیں چھوڑ سکتا اور کسی طرح

بتوں کی پوجا نہیں کرسکتا۔ میں آج تجھ سے جدا ہوتا ہوں مگر غائبانہ تیرے لیے بارگاہ الٰہی میں بخشش طلب کرتا رہوں گا۔''

اب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو پیغامِ رسالت کا مخاطب بنایا۔ مگر قوم بھی اپنے باپ دادا کے دین کو کب چھوڑنے والی تھی۔ اس نے ابراہیم علیہ السلام کی ایک نہ سنی اور بت پرستی کو نہ چھوڑا اور کہہ دیا کہ ''ہم اس جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا یہی کرتے چلے آئے ہیں۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب دیکھا کہ ہر قسم کے وعظ و نصیحت بے کار ہیں تو انھوں نے تبلیغ کا ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ قوم مذہبی میلے کے لیے باہر گئی تو آپ بتوں کی بڑی عبادت گاہ (ہیکل) میں پہنچے۔ تمام بتوں کو توڑ پھوڑ ڈالا اور سب سے بڑے بت کے کندھے پر کلہاڑا رکھ کر چلے آئے۔

قوم واپس ہوئی تو بتوں کا حال دیکھا۔ وہ سخت برہم ہوئے اور فیصلہ دیا کہ یہ کام سوائے ابراہیم علیہ السلام کے اور کوئی نہیں کرسکتا۔ چنانچہ اس بارے میں آپؑ سے پوچھا گیا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ آپؑ بتوں کی بے بسی ظاہر کردیں۔ آپؑ نے فرمایا کہ ''یہ ان میں سے بڑا ہے اگر یہ بولتے ہیں تو ان سے پوچھو''۔ قوم ندامت میں غرق تھی۔ اسے اقرار کرنا پڑا کہ ان کے معبود گونگے اور بہرے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہوگئے کہ ان کے دیوتا نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان، پھر یہ خدا کیسے ہوسکتے ہیں؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نصیحت کے باوجود قوم راہ مستقیم پر گامزن نہ ہوسکی اور عداوت اور دشمنی میں اور بے باک ہوگئی اور فیصلہ کر ڈالا کہ حضرت ابراہیمؑ کی اس جرأت پر انھیں دہکتی آگ میں جلا دو تا کہ ان کی تبلیغ کا قصہ ہی پاک ہوجائے۔

حضرت ابراہیمؑ اور نمرود

یہ مشورے ہو ہی رہے تھے کہ یہ بات عراق کے بادشاہ نمرود تک بھی پہنچ گئی۔ نمرود نہ صرف بادشاہ تھا بلکہ اپنی رعایا کا ''مالک'' اور ''رَبّ'' بھی سمجھا جاتا تھا۔ اسے بھی دوسرے دیوتاؤں کی طرح پوجا جاتا تھا۔ وہ یہ کیسے برداشت کرسکتا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کی تبلیغ سے اسے زوال آئے۔ اس نے حضرت ابراہیمؑ کو طلب کیا۔ انھوں نے بھرے دربار میں بلا خوف و خطر حق کا اعلان کیا اور فرمایا کہ ''میرا ربّ تو وہ ہے جو زندگی عطا کرتا اور موت دیتا ہے''۔ نمرود نے کہا کہ ''میں بھی زندگی دے سکتا ہوں اور مار سکتا ہوں''۔ اور پھانسی کے ایک سزا یافتہ کو آزاد کردیا اور ایک بے گناہ کو مروا ڈالا اور کہا کہ ''دیکھا میں کس طرح زندگی بخشتا اور موت دیتا ہوں''۔

حضرت ابراہیمؑ نے نمرود کو لاجواب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی ہستی کی ایک اور دلیل دی کہ ''میرا خدا سورج کو مشرق سے طلوع کرتا اور مغرب میں غروب کرتا ہے تو ذرا سورج کو مغرب سے نکال کر دکھا''۔ نمرود حیران و ششدر رہ گیا کیونکہ وہ یہ نہ کرسکتا تھا۔

اب بادشاہ سے رعایا تک سبھی لوگ حضرت ابراہیمؑ کے دشمن تھے لیکن وہ بے خوف و خطر لوگوں کو رشد و ہدایت کی طرف بلانے میں مشغول رہے۔ انھیں اپنے خدا پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ اپنے جلیل القدر پیغمبر کو بے یار و مددگار نہ چھوڑے گا۔

نمرود اور اس کی قوم نے حضرت ابراہیمؑ کو جلتی آگ میں پھینکوا دینے کا عزم کرلیا۔ ایک مخصوص جگہ پر کئی روز آگ جلائی گئی۔ جب وہ

خوب دہک گئی تو انھیں آگ میں پھینکوا دیا گیا۔اللّٰہ تعالیٰ نے اسی وقت آگ کو حکم دیا کہ وہ سرد پڑ جائے۔یوں حضرت ابراہیمؑ سالم ومحفوظ رہے۔آگ میں ڈالے جانے کے اس واقعہ تک صرف چند لوگ آپؑ پر ایمان لائے تھے۔

اپنی قوم سے مایوس ہو کر حضرت ابراہیمؑ نے ہجرت کا ارادہ کر لیا اور سفر کرتے کرتے فلسطین پہنچے۔فلسطین سے مصر گئے جہاں شاہِ مصر نے آپؑ کی بڑی عزت وتکریم کی۔آپؑ کی زوجہ محترمہ حضرت ہاجرہ مصر کے اسی شاہی خاندان سے تھیں اور آپؑ کے بیٹے حضرت اسماعیلؑ انھی کے بطن سے ہیں۔حضرت اسماعیلؑ ابھی بچے ہی تھے کہ حضرت ابراہیمؑ کو حکم ملا کہ اپنے ننھے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہ کو مکے میں جا آباد کریں۔آپؑ نے اللّٰہ کے حکم کے مطابق دونوں کو مکے میں جا چھوڑا۔جب حضرت اسماعیل علیہ السلام دس بارہ سال کے ہو گئے تو حضرت ابراہیمؑ کو خواب میں دکھلایا گیا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔آپؑ نے اس خواب کو حکمِ الٰہی سمجھا۔آپ کو اپنی جاں نثاری پر تو پورا اعتماد تھا لیکن یہ دیکھنا باقی تھا کہ دس بارہ سالہ نوجوان اپنی گردن پر چھری چلتے دیکھ سکتا ہے یا نہیں۔بیٹے سے مخاطب ہو کر کہا کہ ''بیٹا! میں خواب دیکھتا ہوں کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں۔تو بتا تیری کیا رائے ہے؟ بیٹا سعادت منداوراطاعت گزار تھا۔باپ کے خواب کو حقیقت بنانے پر ہمہ تن آمادہ ہو گیا اور نہایت استقلال اور حوصلے سے جواب دیا۔

يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (الصّٰفّٰت 102:37)

ابا جان! آپ کو جو حکم ہوا ہے وہ کر گزریئے۔خُدا نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔

چنانچہ حکم خداوندی کی تعمیل میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو پیشانی کے بل لٹا دیا۔کائنات باپ اور بیٹے کے اس حیرت انگیز ایثار اور قربانی پر حیران تھی کہ اللّٰہ کی طرف سے آواز آئی۔

يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۙ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ (الصّٰفّٰت 37:104-105)

''اے ابراہیمؑ! تو نے خواب سچ کر دکھایا۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ذبح ہونے سے بچ گئے لیکن انھوں نے جس استقلال، عزم اور ایثار کے جذبے سے اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کیا اس کا صلہ یہ ملا کہ ان کی قربانی کی یادگار قیامت تک کے لیے باقی رہ گئی اور ان کی نسل سے ایک ایسے نبیؐ کو مبعوث کیا گیا جو پوری دُنیا کے لیے نورِ ہدایت کا سرچشمہ، انبیاؑ میں سب سے افضل اور ان میں سب سے آخری تھے اور نبوّت ورسالت کی تمام خوبیاں بدرجۂ کمال آپؐ میں موجود تھیں۔صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام

حضرت موسیٰ علیہ السلام بنو اسرائیل کے ایک جلیل القدر پیغمبر تھے۔آپؑ کا نسب حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔باپ کا نام عمران تھا۔قرآن عزیز کی مختلف سورتوں میں حضرت موسیٰؑ کے خاندانی واقعات کا تذکرہ ملتا ہے۔انھوں نے 120 سال کی عمر پائی اور ان کا

زمانۂ نبوت اندازاً پندرہویں اور سولہویں صدی قبل مسیح کا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کی پیدائش اس وقت ہوئی جب فرعونِ مصر کے حکم سے بنو اسرائیل کے لڑکے قتل کر دیئے جاتے تھے لیکن حکمتِ خداوندی نے حضرت موسیٰؑ کی پرورش اور حفاظت کا ایسا انتظام فرما دیا کہ ان کی پرورش فرعون کے محل میں اس کی بیوی کی آغوشِ شفقت میں ہوئی۔ قرآن عزیز نے فرعون کی اس بیوی کو''مومنہ'' کہا ہے۔

حضرت موسیٰ جوانی کو پہنچے تو ایک بارعب جوان بنے۔ بنو اسرائیل کی غلامی اور ذلّت پر ان کا دل کڑھتا اور خون کھول اٹھتا۔ یہ شاید اس بات کی علامت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے انھی کو بنو اسرائیل کی نجات کے لیے نبوت و رسالت سے سرفراز فرمانا تھا۔

حضرت موسیٰؑ نے جب اعلانِ نبوت فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں نبوت، رسالت اور پیغامِ صداقت کے نو نشان (معجزات) عطا فرمائے۔ ان میں دو بڑے معجزات ''عصا'' اور ''ید بیضا'' تھے۔ موسیٰؑ کی دُعا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت ہارونؑ کو ان کا وزیر بنا دیا اور نبوت سے بھی سرفراز فرما دیا۔ بنو اسرائیل کو فرعون اور اس کی قوم کی غلامی سے نجات دلانے کا کام دونوں کے سپرد ہوا۔

دونوں بھائی فرعون کے دربار میں پہنچے اور بے خوف و خطر اندر داخل ہو کر اپنے آنے کی وجہ بیان کی اور فرمایا کہ ''فرعون! ہمیں خدا نے اپنا پیغمبرؑ اور رسولؑ بنا کر تیرے پاس بھیجا ہے۔ ہم دو باتیں چاہتے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لا اور کسی کو اس کا شریک نہ بنا۔ دوسرے یہ کہ ظلم سے باز آ اور بنو اسرائیل کو اپنی غلامی سے نجات دے تا کہ وہ خدا کی عبادت میں آزاد ہو جائیں''۔

فرعون اور اس کی قوم عام طور پر سورج کی پوجا کرتی تھی۔ فرعون اس کا اوتار یا مظہر تھا۔ اس لیے فرعون بھی اپنی قوم کا دیوتا بلکہ ''رَبّ'' بنا ہوا تھا۔

حضرت موسیٰؑ نے فرعون اور اس کی قوم کو ''رَبّ العالمین'' کی پرستش کی طرف بلایا۔ نہایت نرمی کے ساتھ فرعون کے درباریوں کو راہِ حق دکھائی اور فریضۂ رسالت ادا کرنے میں ہر مشکل کو برداشت کیا۔ وہ فرعون کے رعبِ شاہی سے قطعاً مرعوب نہ ہوئے۔ فرعون موسیٰ کی باتیں سنتا اور اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا۔ آخر تنگ آ کر فرعون نے موسیٰؑ سے کہا کہ ''اگر واقعی تو اپنی باتوں میں سچّا ہے تو کوئی نشان دکھا۔''

حضرت موسیٰؑ نے بھرے دربار میں اپنی لاٹھی (عصا) کو زمین پر ڈالا۔ وہ اژدہا کی شکل اختیار کر گئی۔ پھر اپنے ہاتھ کو گریبان کے اندر لے جا کر باہر نکالا، وہ چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ فرعون اور اس کے درباریوں نے اسے جادو سمجھا اور حضرت موسیٰؑ کے مقابلے کے لیے اپنے ملک کے ماہر جادوگروں کو طلب کیا لیکن ان کا جادو حضرت موسیٰؑ کے عصا سے مات کھا گیا اور موسیٰؑ کا عصا اژدہا بن کر جادوگروں کے مصنوعی سانپوں کو ہڑپ کر گیا۔ جادوگر اسی وقت حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے پروردگار پر ایمان لے آئے۔

فرعون کا مکر و فریب اور اس کا غیظ و غضب موسیٰؑ کو شکست نہ دے سکا۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارون علیہما السلام تبلیغ کا فرض پورے زور و شور سے ادا کرتے رہے۔ جب ان پر فرعون کی زیادتیاں حد سے بڑھنے لگیں تو فرعون اور اس کی قوم عذابِ الٰہی سے دوچار ہونے لگی۔ یہ عذاب پھلوں کے نقصان، قحط، طوفان، ٹڈی دل، جوں، مینڈک اور خون وغیرہ کی صورت میں تھا۔ جس سے زندگی ان کے لیے دوبھر ہو گئی۔

یہاں جب تبلیغ بے اثر ہو گئی اور اصلاح کی کوئی امید باقی نہ رہی تو حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوا کہ بنو اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نکال لے

جاؤ۔ چنانچہ موسیٰ و ہارون علیہما السلام راتوں رات بنو اسرائیل کو لے کر چل پڑے اور صبح ہونے سے قبل بحرِ قلزم کے کنارے جا پہنچے۔ فرعون کو معلوم ہوا تو ایک زبردست لشکر کے ساتھ ان کا تعاقب کیا اور صبح ہوتے ہی ان کے سر پر جا پہنچا۔ بنو اسرائیل یہ دیکھ کر گھبرا اٹھے اور حضرت موسیٰ سے کہا کہ ''ہم تو پکڑے گئے''۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا۔ ہرگز ایسا نہیں ہوگا۔ میرا پروردگار میرے ساتھ ہے۔ وہ (مجھے اس مشکل سے پار نکلنے کا) راستہ دکھائے گا۔

حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنا عصا بحرِ قلزم پر مارا۔ پانی پھٹ گیا اور درمیان میں خشک راستہ پیدا ہو گیا جس کے ذریعے بنو اسرائیل صحیح و سالم پار اتر گئے۔ فرعون اور اس کے لشکر نے اسی راستے پر ان کا تعاقب کیا لیکن قدرتِ الٰہی سے پانی مل گیا اور فرعون اپنے لشکر سمیت غرق ہو گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم عجیب و غریب عادات کی مالک تھی۔ فرعون سے نجات پانے کے بعد آپؑ نے پوری زندگی اپنی قوم کی اصلاح میں گزار دی اور تبلیغِ حق کا فریضہ شاندار طریقے سے انجام دیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے اولوالعزم، جلیل القدر اور مقدس رسولوں میں سے ایک ہیں۔ آپؑ کے بارے میں بنو اسرائیل کے کئی پیغمبر خوشخبری دیتے چلے آئے تھے۔

قرآن عزیز کی رو سے حضرت عیسیٰ، مریم علیہا السلام کے بطن سے بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت قدرتِ کاملہ کا اعجاز تھی۔ وہ خُدا کی طرف سے ''رحمت'' اور اس کا ''کلمہ'' تھے۔ لقب مسیح پایا اور نام عیسیٰ (یسوع) ہے۔ شیر خوارگی ہی میں لوگوں سے باتیں کیں اور ماں کی پاکیزگی کی گواہی دی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ''کتاب'' دیئے جانے اور ''نبوت'' عطا کیے جانے کا اعلان کیا۔

حضرت عیسیٰ سے قبل بنو اسرائیل اعتقاد اور اعمال کے لحاظ سے برائیوں میں مبتلا تھے۔ حتیٰ کہ اپنی ہی قوم کے پیغمبروں کے قتل پر دلیر ہو گئے تھے۔ جھوٹ، فریب، بغض، حسد جیسی بداخلاقیوں کو اخلاق سمجھتے اور ان پر فخر کرتے۔ ان کے مذہبی پیشواؤں نے دنیوی لالچ کی خاطر اللہ کی کتاب ''تورات'' کو بدل ڈالا۔ نیز حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دے دیا۔

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت عیسیٰؑ کو قوم کی ہدایت کے لیے منتخب کیا تو انھیں کتاب اللہ یعنی ''انجیل'' سے نوازا اور زمانے کے حالات کے مطابق قوم کی راہنمائی کے لیے انھیں معجزات بھی عطا فرمائے۔

حضرت عیسیٰ پیغامِ ہدایت اور تبلیغِ حق کی خدمت انجام دیتے ہوئے اپنی قوم کو بری عادتوں سے اجتناب کرنے، مال و دولت کے لالچ سے بچنے اور عیش پسند زندگی سے باز رہنے کا سبق دیتے رہے لیکن بنو اسرائیل پر ان کی تبلیغ کا کوئی اثر نہ ہوا۔

حضرت عیسیٰ مخالفتوں کے باوجود اپنے فرضِ منصبی میں سرگرمِ عمل رہے اور شب و روز بنو اسرائیل کی بستیوں میں پیغامِ حق سناتے رہے

مگر بد بخت بنو اسرائیل اپنی سرکشی، انبیاؑ سے دشمنی اور تعلیم الٰہی سے بغاوت کی وجہ سے حق کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ایک چھوٹی سی جماعت کے علاوہ ان کی قوم کی اکثریت نے حضرت عیسیٰؑ کی مخالفت کی اور ان کے ساتھ بغض و حسد کو اپنی عادت بنا لیا۔

حضرت عیسیٰؑ پر جو چند لوگ ایمان لائے وہ انتہائی مخلص اور جاں نثار تھے۔ قرآن عزیز نے ان لوگوں کو ''حواری'' اور ''انصار اللّٰہ'' کہا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے نہ شادی کی اور نہ ان کے اہل و عیال تھے۔ وہ شہر شہر، گاؤں گاؤں پیغام حق سناتے اور ان کی مقدس ذات سے مخلوقِ خدا جسمانی اور روحانی دونوں طرح کی شفا پاتی تھی۔ اس لیے ہر ایک ان سے محبت کرتا۔ بنو اسرائیل نے ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو حسد اور خطرے کی نگاہ سے دیکھا اور فیصلہ کیا کہ بادشاہ وقت کو ان کے خلاف مشتعل کر کے انھیں سولی پر چڑھوا دیا جائے۔

یہ خطرہ محسوس کر کے حضرت عیسیٰؑ نے اپنے حواریوں کو ایک مکان میں جمع کیا اور صورتِ حال ان کے سامنے پیش کی۔ سب نے جاں نثاری کا عہد کیا اور حضرت عیسیٰؑ انتظار کرنے لگے کہ دشمنوں کی سرگرمیاں کیا صورت اختیار کرتی ہیں۔

آخر ان پر ملک سے غداری کا مقدمہ چلا۔ فلسطین پر اس وقت رومیوں کی حکومت تھی جن کی عدالت نے حضرت عیسیٰؑ کو پھانسی کی سزا سنائی۔ قرآن عزیز کے مطابق آپؑ کو نہ قتل کیا گیا اور نہ ہی سولی پر چڑھایا گیا بلکہ دشمنوں پر صورتِ حال مشتبہ ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو صحیح و سالم اپنی طرف اُٹھا لیا۔

انبیا علیہم السلام کی زندگی کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ ان عظیم ہستیوں نے اللہ کے دین کی خاطر کتنی قربانیاں دیں اور کس قدر صبر و استقلال کا مظاہرہ کیا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تکمیلِ فریضۂ رسالت

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا کام تمام دُنیا میں دین اسلام کا اعلان کرنا تھا۔ آپؐ نے دین اسلام کی تبلیغ کے لیے دنیا کی تمام قوموں کو مساوی اور برابر سمجھا اور تمام اقوام عالم کو خدا کے پیغام کا مستحق جانا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس فرض کی تکمیل کے لیے جس قدر جدو جہد کی اور اس راہ میں جتنی مشکلات اور مصائب کا سامنا کیا، ان کی تفصیل بہت لمبی اور طویل ہے۔ آپؐ کی تبلیغِ دین اور تکمیلِ فریضۂ رسالت کے دو بڑے دور ہیں: مکی اور مدنی۔

فریضۂ رسالت کا مکی دور

آپؐ کی تبلیغِ دین اور دعوتِ حق کا یہ ایسا دور ہے جس میں آپؐ کو مخالفتوں کے بڑے بڑے طوفانوں سے گزرنا پڑا۔ آپؐ نے رسولؐ کی حیثیت سے کلمۂ حق کی آواز بلند کی تو زمانے کی آنکھوں کا رنگ اچانک بدل گیا۔ آپؐ کی صداقت، دیانت، شرافت کی قدر و قیمت یکا یک ختم ہوگئی۔ کل تک جو شخص قوم کا مایۂ ناز فرزند تھا آج وہی قوم اس کو اپنا دشمن اور مخالف سمجھنے لگی۔ کل تک جس کا احترام بچہ بچہ کرتا تھا آج اسے حقیر

سمجھا جانے لگا۔ وہ شخص جو چالیس برس تک سچائی اور امانت و دیانت کی ہر آزمائش میں کھرا ثابت ہوا' توحید' نیکی اور سچائی کا پیغام سناتے ہی سردارانِ قریش کی نگاہوں میں کھٹکنے لگا۔ خودغرضی نے اہلِ مکہ کو مجبور کر دیا کہ حق کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور جب انسان آنکھیں رکھتے ہوئے اندھا بن جاتا ہے تو بڑی بڑی تباہیاں رونما ہوتی ہیں۔

قریش کی مخالفت:

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کردار میں نہ تو کوئی خامی تھی جو قریش کو آپؐ کی مخالفت پر اکساتی اور نہ آپؐ نے کوئی ایسی جماعت کھڑی کرنے کی کوشش فرمائی تھی جو مال اور جائیداد سمیٹتی بلکہ مخالفت کی وجہ محض خودغرضی تھی۔

قریشِ مکہ سالہاسال سے اپنی قوم کے سیاسی و مذہبی چودھری تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ عرب کے مشرکانہ مذہب کے ٹھیکے دار بھی تھے۔ وہ پورے عرب سے نذریں' نیازیں اور چڑھاوے وصول کرتے۔ مذہب جب کاروبار بن جاتا ہے تو اس کی اصل روح فنا ہو جاتی ہے۔ گوناگوں رسموں اور من گھڑت روایتوں کا ایک طلسم قائم ہو جاتا ہے۔ خدا کا دیا ہوا علم اور قانون گم ہو جاتا ہے اور اپنی بنائی ہوئی شریعت آہستہ آہستہ نشوونما پاتی چلی جاتی ہے۔ حق' نیکی' شرافت اور تقویٰ کا نام ونشان مٹ جاتا ہے اور مذہب فریب کاری کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ قریشِ مکہ کی مذہبی ٹھیکہ داری اور مجاوری اسی فریب کاری پر قائم تھی اور انھیں یہ گوارا نہ تھا کہ اس کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند ہو اور ان کی مذہبی اجارہ داری ختم ہو جائے۔ پھر قریش کی معاشرت فاسقانہ تھی۔ شراب' بدکاری' جوا' سودخوری' عورتوں کی تذلیل' بیٹیوں کا زندہ دفن کرنا' انسانوں کو غلام بنانا' کمزوروں پر ظلم ڈھانا' قتل و غارت گری اور بری عادت پر فخر' یہ سب ان کی زندگی کے لوازم تھے۔ قریش کے لیے آسان نہ تھا کہ اپنی ان پختہ عادتوں کو چھوڑ دیں۔ انھیں محسوس ہو گیا کہ دعوتِ محمدیؐ ان کی عادات' ان کی خواہشات اور ان کی معاشرت کی دشمن ہے۔ چنانچہ وہ اس کے خلاف تلملا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اسلام کے خلاف انھوں نے متحدہ محاذ قائم کر لیا۔

خفیہ دعوتِ اسلام:

غارِ حرا میں پہلی وحی کے نزول کے بعد آپؐ گھر تشریف لائے تو آپؐ جلال الٰہی سے لبریز تھے۔ اب آپؐ خدا کی طرف سے دعوتِ حق پر باقاعدہ مامور تھے۔ اس دعوت کو سب سے پہلے قبول کرنے والے حضرت خدیجہؓ، حضرت علی مرتضیٰؓ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت زیدؓ تھے۔ یہ وہ افراد تھے جو آپؐ کی انفرادی اور مجلسی زندگی اور آپؐ کے کردار کے ظاہر و باطن سے پوری طرح آگاہ تھے۔

دعوتِ حق کا یہ سلسلہ خفیہ اور دھیمی رفتار سے چل رہا تھا۔ بڑی خاموشی' رازداری اور احتیاط سے یہ کام ہو رہا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حلقۂ اثر میں جو لوگ تھے ان میں حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف' حضرت سعدؓ بن ابی وقاص' حضرت طلحہ رضوان اللہ علیہم ایمان لے آئے۔ ان کے علاوہ عمارؓ، خبابؓ، ارقمؓ، سعیدؓ بن زید، عبداللہؓ بن مسعود، عثمانؓ بن مظعون، عبیدہؓ اور صہیب رومیؓ اسلامی تاریخ کے اس خفیہ دور میں ہی سابقین اولین کی صف میں آئے۔ حضرت ابوذرؓ ایمان لانے والوں میں چھٹے یا ساتویں تھے۔ اسلام کے ان اولین علمبرداروں میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اعلیٰ درجے کے مذہبی یا قومی منصب پر فائز ہو۔ قریشِ مکہ نے ان چند لوگوں کے ایمان لانے کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور مذہبی قیادت اور سیاسی سرداری کی قوت کے زعم میں مگن رہے۔ سچائی آہستہ آہستہ پروان چڑھتی رہی اور اس طرح تین سال گزر گئے۔

دعوتِ عام:

اب وقت آ گیا تھا کہ لوگوں کو کھلم کھلا اسلام کی جانب بلایا جائے۔ حکمِ الٰہی پہنچا۔

فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ (الحجر 94:15)

جو کچھ حکم دیا جا رہا ہے اسے واشگاف الفاظ میں کہہ دیجیے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی پوری ہمت و عزیمت کے ساتھ کوہِ صفا پر آ کھڑے ہوئے۔ قوم کو پکارا، وہ جمع ہوئی تو برسرِ عام اعلان فرمایا: کہ ''خدا پر ایمان لاؤ ورنہ تم پر سخت عذاب نازل ہوگا''۔ آپؐ کے اس پیغام کو قوم نے قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ وہ برہم ہوئے اور چلے گئے۔

آپؐ نے دعوتِ عام کے دوسرے مرحلے پر تمام خاندان عبدالمطلب کو کھانے پر جمع کیا اور پیغامِ حق سنایا اور فرمایا کہ ''جس پیغام کو لے کر میں آیا ہوں یہ دین اور دُنیا کی بھلائی کا ضامن ہے۔ کون اس مہم میں میرا ساتھ دیتا ہے''۔ اس پر ایک سکوت چھا گیا۔ حضرت علی مرتضیٰؓ نے جو اس وقت تیرہ برس کے تھے اُٹھ کر کہا کہ ''اگر چہ میری پنڈلیاں کمزور ہیں لیکن میں اس مہم میں آپؐ کا ساتھ دوں گا''۔ آپؐ کے خاندان نے اسے ایک مذاق اور جنون سمجھا۔

مخالف ماحول کی وجہ سے آنحضورؐ اور آپؐ کے ساتھی شہر سے باہر وادیوں اور گھاٹیوں میں چھپ کر نمازیں پڑھتے۔ مشرکینِ مکہ نے ایک بار انھیں دیکھ لیا اور عین حالتِ نماز میں انھیں برا بھلا کہا۔ ایک مشرک نے تلوار نکال کر حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو زخمی کر ڈالا۔ خون کی یہ پہلی دھار تھی جو خاکِ مکہ پر خُدا کی راہ میں بہی۔

کھلم کھلا کلمۂ حق پکارنے کا حکم تو آ ہی چکا تھا۔ آپؐ نے اس کی تعمیل میں ایک دن حرمِ کعبہ میں توحید کا اعلان کیا۔ قریشِ مکہ نے اسے کعبے کی توہین سمجھتے ہوئے تلواریں کھینچ لیں۔ حارثؓ بن ابی ہالہ آپؐ کو بچانے دوڑے۔ وہ تلواروں کی زد میں آ گئے اور شہید ہو گئے۔ اسلام اور جاہلیت کی کشمکش میں یہ پہلی جان تھی جو حمایتِ حق میں قربان ہوئی۔

دعوتِ حق کی مخالفت کے طریقے:

قریشِ مکہ نے آپؐ کے خلاف گندے پروپیگنڈے اور گالیوں کا سہارا لیا۔ کہتے کہ ''اس شخص کی بات کیوں سنتے ہو یہ اپنے آباؤ اجداد کے دین سے پھر گیا ہے''۔ کبھی کہتے کہ ''اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے''۔ کبھی کہتے کہ ''یہ شخص جادوگر اور کاہن ہے''۔ اور کبھی آپؐ کو شاعر ہونے کا الزام دیتے۔ اس سلسلے میں مخالفت کا ایک محاذ شعرائے عرب کا تھا۔ وہ آپؐ کے خلاف ہجو یہ اشعار کہتے۔ گلی گلی اور کوچے کوچے اسے نشر کرتے، لیکن آنحضورؐ کا پیغام اور کردار بجائے خود شاعروں کی اس حرکت کا توڑ تھا۔

یہ ساری مہم اس لیے تھی کہ لوگ آپؐ کی بات سننے نہ پائیں۔ انہوں نے مل کر طے کیا تھا۔

لَاتَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَO (حٰمٓ السجدة26:41)

یعنی قرآن کو سنو ہی نہیں بس ہاؤ ہو کا خوب شور مچا کر اس میں رخنہ اندازی کرو اور اس طرح غلبہ حاصل کر لو۔

مذاق اور استہزاء:

مشرکینِ مکہ آپؐ کا اور آپؐ کی تعلیمات کا مذاق اڑاتے۔ بار بار پوچھتے کہ تم اگر نبیؐ ہو تو تمھارے نبی ہونے کی کوئی واضح نشانی تمھارے ساتھ کیوں نہیں؟ انھیں اس پر بھی اعتراض تھا کہ قرآن تھوڑا تھوڑا کیوں نازل ہو رہا ہے۔ ان کے دیکھتے دیکھتے پوری کتاب یکبارگی ہی کیوں آسمان سے نہیں اترتی؟ فرشتوں کے جھنڈ ان کے سامنے زمین پر انسانوں کی طرح اتریں اور خدا خود ان کے سامنے آ جائے۔ کبھی کہتے کہ تم تو ہماری ہی طرح کے آدمی ہو۔ گلیوں اور بازاروں میں پھرتے ہو۔ کھانا کھاتے ہو۔ تم کیسے نبی ہو سکتے ہو؟ آپؐ پر پھبتیاں کسی جاتیں۔ جدھر سے آپؐ کا گزر ہوتا انگلیاں اُٹھا اُٹھا کر کہتے۔

اَهٰذَا الَّذِیْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلاًO (الفرقان41:25)

ذرا دیکھنا، یہ ہیں وہ صاحب جنھیں اللّٰہ نے رسول مقرر کیا ہے۔

آنحضورؐ کے ساتھیوں پر فقرے چُست کرتے کہ:

اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ط (الانعام53:6)

کیا یہ ہیں وہ ممتاز ہستیاں جن پر اللّٰہ تعالیٰ نے ہم سے الگ اپنا فضل فرمایا ہے؟

مذاق کے طور پر کہتے کہ اے محمدؐ! جس عذاب کی روز روز دھمکیاں دیتے ہو اسے لے کر کیوں نہیں آتے؟ یا نافرمان کافروں پر آسمان کا کوئی ٹکڑا کیوں نہیں توڑ گراتے تاکہ ان کا خاتمہ ہو جائے؟ قیامت کا مذاق اڑاتے اور بڑے ڈرامائی انداز میں دریافت کرتے۔

مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ

کہ یہ حادثہ کب ہونے والا ہے؟ کیا اس کی کوئی تاریخ یا گھڑی معین نہیں؟

استہزاء، مذاق اور کٹ حجتی کے اس طوفان سے آنحضور صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے ساتھی پورے عزم و استقلال سے گزرتے رہے اور تبلیغِ حق کا فرض ادا کرتے رہے لیکن قریش کا اشتعال آپؐ کے خلاف روز بروز بڑھتا گیا۔

غنڈہ گردی:

قریش کی مخالفت اب غنڈہ گردی کی صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ آپؐ کو تنگ کرنے کے لیے انھوں نے ایسی کمینہ حرکتیں کیں کہ آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کوئی اور ہوتا تو بڑی سے بڑی اولوالعزمی کے باوجود اسے برداشت نہ کر سکتا۔ آپؐ کے محلے دار اور پڑوسی بڑے اہتمام سے آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھاتے۔ نماز پڑھتے وقت شور مچاتے۔ عین حالتِ نماز میں گندگی اور غلاظت آپؐ پر ڈالتے۔ محلے کے لڑکوں کو پیچھے لگا دیتے۔ قرآن اور قرآن پڑھنے والے کو گالیاں دیتے۔ اس معاملے میں ابولہب اور اس کی بیوی پیش پیش

تھی۔ مشرکین نے حق وصداقت کا راستہ کانٹے بچھا بچھا کر روکنا چاہا۔ گندگی پھینک کر کوشش کی گئی کہ توحید اور حسنِ اخلاق کے پیغام کی پاکیزگی کو ختم کر دیا جائے' لیکن آپؐ ان تمام رکاوٹوں کو خاطر میں نہ لائے اور دعوتِ حق کو جاری رکھا۔

حمایت سے محروم کرنے کی کوشش:

قریش کی غنڈہ گردی بھی جب حق کا راستہ نہ روک سکی تو انھوں نے چاہا کہ آپؐ کو آپؐ کے حامیوں سے محروم کر دیا جائے۔ چنانچہ اکابرِ قریش کا ایک وفد ابوطالب کے پاس پہنچا اور چاہا کہ وہ اپنے بھتیجے کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں۔ چچا نے آپؐ کو سمجھانا چاہا تو آپؐ کا جواب یہ تھا کہ ''خدا کی قسم! یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ کر چاہیں کہ میں اس کام کو چھوڑ دوں تو جب بھی اس سے باز نہ آؤں گا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کو غالب کر دے یا میں اسی جدوجہد میں ختم ہو جاؤں''۔

اکابرِ قریش کی یہ چال ناکام ہوئی تو انھوں نے آپؐ کے ساتھیوں پر سختیاں کرنے کے لیے تمام قبائلِ عرب کو اکسانا شروع کر دیا۔ چنانچہ جہاں کہیں کوئی مسلمان تھا اس پر ظلم ڈھایا جانے لگا۔ لیکن یہ سختیاں کسی ایک مسلمان کو بھی اسلام سے برگشتہ نہ کر سکیں۔

حج کے موسم میں قبائلِ عرب جوق در جوق مکے آتے تھے۔ نبی کریمؐ اپنا پیغام پھیلانے کے لیے خیمہ بہ خیمہ جاتے۔ حج کی طرح آپؐ میلوں کے اجتماعات میں بھی تشریف لے جاتے اور تبلیغ کا فرض ادا کرتے۔ ابوجہل آپؐ کے ساتھ لگا ہوتا۔ مٹی اُٹھا اُٹھا کر آپؐ پر پھینکتا اور کہتا کہ لوگو! اس کے فریب میں نہ آنا۔ یہ چاہتا ہے کہ تم لات اور عزّیٰ کی پرستش چھوڑ دو''۔

مخالفینِ اسلام ہر اہم شخصیت کو، جب وہ مکے میں آتی، آنحضورؐ کی ملاقات سے روکتے مگر اس کا اُلٹا اثر ہوتا۔

قریش کی ایک اور چال:

قریش نے آپؐ کو تبلیغِ حق سے روکنے کے لیے سودا بازی کی کوشش کی اور عتبہ بن ربیعہ کو آپؐ کی خدمت میں بھیجا۔ اس نے خوشامد آمیز تمہید کے بعد مدعا بیان کیا اور پیش کش کی کہ:

1- اگر تم دولت چاہتے ہو تو اتنی دولت جمع کیے دیتے ہیں کہ تم سب سے زیادہ مالدار بن جاؤ۔
2- سردار یا بادشاہ بننا چاہتے ہو تو ہم تمھیں اپنا سردار اور بادشاہ تسلیم کر لیتے ہیں۔
3- اگر مقصد کسی حسین عورت سے شادی ہے تو عرب کی حسین ترین عورت سے شادی کا انتظام کیے دیتے ہیں۔

یہ تمام باتیں بڑے سے بڑے پاک باز کو بھی ڈگمگا دینے کے لیے کافی تھیں لیکن آپؐ نے اس کے جواب میں سورۂ حٰمٓ کی آیات تلاوت فرمائیں۔ عتبہ جب وہاں سے رخصت ہوا تو اس کا رنگ بدل چکا تھا۔

ہجرتِ حبشہ:

قریشِ مکہ نے آپؐ کے خلاف تمام حربے آزما لیے۔ نتیجتاً مسلمانوں پر اب ان کا تشدد شباب پر تھا۔ مکہ کی سرزمین مسلمانوں کے لیے تنگ ہوگئی تھی اور ان کے صبر کا پیمانہ چھلک اُٹھا تھا۔ آپؐ تو اِذنِ ربی کے بغیر مکہ چھوڑ نہ سکتے تھے۔ البتہ آپؐ نے ستم رسیدہ اور مظلوم مسلمانوں کو ملک حبش کی طرف ہجرت کی اجازت دے دی۔ مسلمانوں کی یہ جماعت گیارہ مردوں اور چار عورتوں پر مشتمل تھی۔ یہ مسلمان تھوڑا ہی عرصہ حبش میں رہے اور یہ افواہ سن کر کہ قریش نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ مکے لوٹ آئے لیکن یہ افواہ غلط تھی۔ قریش کا جبر و تشدد اب اور شدت اختیار کر گیا اور اب کی بار 85 مرد اور 17 عورتوں کا قافلہ حبشہ پہنچا۔ قریش نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا' لیکن وہاں کے انصاف پسند بادشاہ کے سامنے ان کی ایک نہ چل سکی۔

اسلام کی قوت میں اضافہ:

اب آپؐ کے چچا حضرت حمزہؓ اور قریش کے فرزند حضرت عمرؓ بھی ایمان لے آئے تھے۔ ان دونوں کا اسلام قبول کر لینا حد درجہ تقویت کا باعث بنا اور حضرت عمرؓ نے تو عین حرم کعبہ میں اپنے اسلام کا اعلان کیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اسلام اب ایک قوت بن کر ابھرے گا۔

مقاطعہ اور نظر بندی:

دُشمنانِ حق اپنی تمام کوششوں کے باوجود تبلیغِ حق کو نہ روک سکے۔ حق کا سیلاب جتنا آگے بڑھتا قریش کے اضطراب میں بھی اسی قدر اضافہ ہو جاتا۔ مکے کے تمام قبائل نے محرم 7 نبوی میں ایک معاہدہ کیا اور طے پایا کہ بنو ہاشم کا بائیکاٹ کیا جائے اور ان سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ رکھا جائے۔ بنو ہاشم بے بس ہو کر شعبِ ابی طالب میں پناہ گزین ہوئے۔ نظر بندی کا یہ انتہائی سخت دور تین برس تک رہا اور حالت یہ ہوگئی کہ درختوں کے پتے اور سوکھے چمڑے ابال ابال کر کھائے جانے لگے اور بچے بھوک سے تڑپنے لگے۔ آخر قریش ہی کے ایک خدا ترس شخص ہشام بن عمرو کی کوششوں سے یہ ظالمانہ فیصلہ ختم ہوا۔

سالِ غم:

بائیکاٹ کا خاتمہ ہو گیا لیکن اب آنحضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو اس سے بھی سخت تر حالات کا سامنا کرنا پڑا۔

نبوت کے دسویں سال ابو طالب وفات پا گئے اور دشمنوں سے حفاظت کا واحد ظاہری سہارا بھی آپؐ سے چھن گیا۔ اسی سال آپؐ کی مونس و غمگسار بیوی حضرت خدیجہؓ کا بھی انتقال ہو گیا۔ آپؓ نے تا دمِ آخر راہِ حق میں حضورؐ کی سچی رفاقت کا حق ادا کیا اور اسلام کے لیے اپنی ساری دولت وقف کر دی۔

ان دو سہاروں کے چھن جانے سے قریشِ مکہ اور بے باک ہو گئے اور مخالفت کا طوفان اور شدت اختیار کر گیا۔ اب قریش آنحضورؐ کی جان کے درپے تھے۔

طائف میں دعوتِ حق:

آنحضورؐ نے جب یہ دیکھا کہ مکے کے لوگوں پر اب تبلیغ بے اثر ثابت ہورہی ہے اور ان میں دعوتِ حق کی اب مزید گنجائش نہیں تو مکے سے باہر تبلیغِ دین کا ارادہ فرمایا۔آپؐ مکے سے پیدل چلے اور راستے میں قبائل کو دعوتِ حق دیتے طائف پہنچے۔یہاں کے لوگ خوشحال مگر خدا فراموش اور بداخلاق تھے۔آپؐ نے رئیسانِ طائف کے سامنے اسلام پیش کیا لیکن ہر ایک نے ایک دوسرے سے بڑھ کر حق کی مخالفت کی۔ مزید یہ کہ بازاری لڑکوں کو آپؐ کے پیچھے لگایا کہ وہ پتھر مار مار کر آپؐ کو شہر سے نکال باہر کریں۔پتھر تاک کر ٹخنوں پر مارے جاتے کہ تکلیف زیادہ ہوحتیٰ کہ آپؐ کے جوتے خون سے بھر گئے۔آپؐ نے بے دم ہوکر شہر سے باہر انگور کے ایک باغ میں پناہ لی۔اتنی اذیت اور تکلیف اُٹھانے کے باوجود آپؐ نے اہلِ طائف کے لیے کوئی بددُعا نہ کی۔جبریلؑ حاضر ہوئے اور کہا کہ "حکم ہو تو اہلِ طائف پر یہ پہاڑ اُلٹ دوں"۔لیکن رحمت للعالمین نے یہ گوارا نہ فرمایا۔

واقعۂ طائف کے بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو معراج سے سرفراز کیا گیا اور حضورؐ کو قربِ الٰہی کا انتہائی بلند مقام نصیب ہوا۔

اے مکہ! ......الوداع:

طائف مکہ سے بھی بڑھ کر دعوتِ حق کے لیے بنجر اور تکلیف دہ ثابت ہوا۔حضور صلی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلم انتہائی ناسازگار اور حوصلہ شکن حالات کے باوجود پُر یقین تھے کہ صبحِ نَو اب یثرب میں ضرور طلوع ہوگی جہاں کے کچھ نوجوان بڑے خلوص کے ساتھ اسلام کی آواز پر لبیک کہہ رہے تھے۔پہلی بیعتِ عقبہ اور دوسری بیعتِ عقبہ میں اہلِ یثرب کے قبیلوں اوس وخزرج کے متعدد افراد اسلام قبول کر چکے تھے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو یثرب کی طرف ہجرت کی دعوت دے کر آپؐ کی حفاظت کا عہد کر چکے تھے۔

جب قریش کا ظلم حد سے بڑھ گیا اور علمبردارانِ حق کا پیمانہ صبر بھی لبریز ہوگیا تو حضورؐ نے اپنے ساتھیوں کو یثرب جانے کی اجازت دے دی اور آہستہ آہستہ ان کی بہت سی تعداد مکے سے نکل گئی لیکن حضورؐ نے اپنے مقامِ دعوت کو نہ چھوڑا اور خدا کے حکم کے منتظر رہے۔مکہ میں سوائے ان چند مسلمانوں کے کوئی نہ رہا تھا جو بے وسیلہ اور بے کس تھے اور جنھیں قریش نے مصیبت میں ڈال رکھا تھا۔البتہ آپؐ کے خاص رفقاء حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ باقی تھے۔

قریشِ مکہ بھی بے خبر نہ تھے۔انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ حضورؐ بھی یہاں اب چند دن ہی ٹھہریں گے کیونکہ مسلمانوں کو ایک ٹھکانہ مل گیا تھا۔وہ آپؐ کے قتل کی سازشوں میں مصروف تھے مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

ہجرت کی اجازت آ گئی تو حضور صلی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی معیت میں سفرِ ہجرت فرمایا۔آپؐ اس رات گھر پر نہیں سوئے اور اپنے محبوب ترین رفیق حضرت علی مرتضیٰؓ کو بلاخوف اپنے بستر مبارک پر سو جانے کی ہدایت فرمائی۔قریش نے حضورؐ کے مکان کا محاصرہ رات بھر جاری رکھا مگر اچانک انھیں معلوم ہوا کہ جس کی تلاش تھی وہ تو جا چکا وہ حضرت علی مرتضیٰؓ کو آپؐ کے بستر پر پا کر بہت سٹپٹائے۔

دَورانِ سفر میں آپؐ تین روز غارِ ثور میں رہے اور دشمنانِ دین آپؐ کی تلاش میں سر مارتے رہے۔ سراقہ بن جُعشُم آپؐ تک پہنچا بھی لیکن کرشمۂ قدرت سے اسے ہاتھ اُٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔ بریدہ اسلمی ستر ہمراہیوں کے ساتھ انعام کے لالچ میں تلاش کو نکلا لیکن سامنے آیا تو کایا پلٹ گئی اور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اسلام لے آیا۔

فریضۂ رسالت (مدینے میں)

انسانوں کے سب سے بڑے محسن اور تاریخ عالم کی سب سے بڑی شخصیت حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی زندگی کا مکی دور دعوت اور تبلیغ کا دور تھا اور مدنی دور دعوت اور غلبۂ حق دونوں کا۔

حقیقت یہ ہے کہ آپؐ نے بعثت کے بعد اپنی زندگی کا ہر لمحہ اپنے منصب کی تکمیل میں گزارا۔ اور وہ منصب تھا ''اللہ کے دین کی تبلیغ اور اس کا نفاذ''۔ یوں مکے میں محنت اور صبر کے تحت افراد تیار ہوئے اور مدینے میں ایک مثالی اجتماعی نظام وجود میں آیا اور دین کے احکام نافذ ہوئے۔

یہ درست ہے کہ مدینے میں اسلام ایک طاقت بن کر اُبھرا۔ لیکن یہاں بھی مشکلات کم نہ ہوئیں اور شر انگیز عناصر نے حضورؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کو یہاں بھی شروع سے آخر تک پریشان رکھا اور ایک نئے معاشرے کی تعمیر میں رکاوٹیں ڈالیں۔

مدینے کا اصل نام یثرب تھا۔ یہاں دو قسم کے لوگ آباد تھے۔ یہود اور غیر یہود۔ یہ پورا علاقہ یہودیوں کے مذہبی اور سیاسی اثر میں تھا۔ یہود اکثر اہلِ یثرب کو ایک نبیؐ کے مبعوث ہونے کی خبر دیا کرتے تھے کیونکہ تورات میں آپؐ کی آمد کی پیشین گوئی موجود تھی۔

نبوت کے گیارہویں سال مدینے سے حج کے لیے جو گروہ آیا وہ مسلمان ہو گیا تھا۔ یہ چھ اشخاص تھے۔ مدینے میں ان کی کوششوں سے اسلام پھیلنے لگا۔ اگلے برس بارہ افراد کا وفد مکے پہنچا اور مشرف بہ اسلام ہوا۔ حضورؐ نے مصعبؓ بن عمیر بن ہاشم کو ان کے ساتھ مدینہ بھیجا تاکہ لوگوں کو قرآن پڑھائیں اور اسلام کی دعوت دیں۔ ان ہی کی کوششوں سے اوس اور خزرج کے دو سرداروں سعد بن معاذؓ اور اُسیدؓ بن حضیر نے اسلام قبول کیا تھا جس سے مسلمانوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔

اگلے سال قریباً پچھتر آدمی مدینے سے آئے اور حج کے موقع پر ایمان لائے۔ اس موقع پر انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کو اپنے ہاں تشریف لانے کی دعوت دی۔

مدینے میں آمد:

حضور صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم نے مدینے میں اسلام کو پھلتا پھولتا دیکھ کر مکے کے مسلمانوں کو مدینے کی طرف ہجرت کی اجازت دے دی۔ ان مہاجرین کی تعداد جوں جوں مدینے میں بڑھ رہی تھی، دعوتِ حق کا اُجالا بڑھتا جا رہا تھا۔ اب تو انصار و مہاجرین کی نگاہیں مکے سے آنے والے راستے پر لگی ہوئی تھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کب تشریف لاتے ہیں کیونکہ یہ خبر مدینہ پہنچ چکی تھی کہ حضورؐ مکہ چھوڑ چکے ہیں۔

مدینے پہنچنے سے قبل آپؐ کا قیام ''قبا'' نامی بستی میں ہوا جو مدینے سے تین میل کے فاصلے پر تھی۔ یہاں آپؐ نے ایک مسجد تعمیر کی۔ اسلام کی یہ پہلی مسجد تھی جس کی شان میں قرآن عزیز نے کہا:

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى (التوبۃ 108:9) یہ ایسی مسجد ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر ہے۔

چودہ دن قبا میں قیام کے بعد آپؐ اپنے ساتھیوں سمیت مدینے میں وارد ہوئے اور دل و جان آپؐ کے استقبال کے لیے فرشِ راہ کیے گئے۔ مدینے کا نصیبا جگمگا اُٹھا۔ عارضی قیام کے لیے حضرت ابوایوب انصاریؓ کی قسمت جاگی۔ یہاں سات ماہ قیام رہا۔

تعمیری اقدامات:

مدینے پہنچ کر اوّلین مہم مسجد کی تعمیر تھی جس کے لیے زمین حاصل کی گئی۔ قیمت ابوایوب انصاریؓ نے ادا کی۔ اس کی تعمیر میں ہر شخص نے دل و جان سے حصہ لیا۔ یہی مسجد نبوی ہے جو اسلامی نظامِ تمدن و ریاست کا سرچشمہ اور مرکز بنی۔ اسی مسجد کے ساتھ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کے لیے حجرے تعمیر ہوئے اور اسی مسجد کے ساتھ وہ سائبان اور چبوترہ تھا جو ''صُفّہ'' کہلاتا تھا۔ یہ اسلام کی پہلی درس گاہ تھی اور ان لوگوں کا مسکن تھا جو ہر وقت اسلامی تعلیم میں مصروف رہتے تھے۔

نظامِ مواخات:

مدینے کے معاشرے کا ایک بڑا مسئلہ مہاجرین کی بحالی کا تھا۔ آپؐ نے جس کمالِ حکمت سے اسے حل کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ ایک ایک مہاجر کا ایک ایک انصاری کے ساتھ برادرانہ رشتہ قائم کر دیا۔ انصار کا یہ حال تھا کہ وہ اپنی ہر چیز کو آدھا بانٹ کر اپنے مہاجر بھائی کو دے دیتے لیکن مہاجرین کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ وہ محنت مزدوری سے روزی کمانے کو ترجیح دیتے۔ اُخوت اور بھائی چارے کا یہ رشتہ حقیقی رشتوں سے بھی بڑھ گیا۔ حتیٰ کہ کوئی انصاری مرتا تو اس کے مال و جائیداد میں اس کے مہاجر بھائی کا بھی حصہ ہوتا۔ یہاں تک کہ وراثت کے احکام نازل ہوئے۔

اسلامی ریاست کا قیام:

یہود کے تین قبیلے مدینے کے آس پاس آباد تھے۔ یہود و انصار میں اسلام سے قبل کئی خونریز معرکے ہو چکے تھے۔ یہود ہمیشہ یہ چاہتے تھے کہ انصار کبھی متحد نہ ہونے پائیں۔

اسلامی ریاست کے قیام کے لیے حضور صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کا سب سے پہلا سیاسی اقدام مدینے کے یہود اور مسلمانوں کو ایک انتظام میں پرو دینا تھا۔ چنانچہ تنظیم معاشرہ کے لیے سیاسی نوعیت کا ایک معاہدہ یہود اور مسلمانوں میں طے پایا، جو تاریخِ اسلام میں ''میثاقِ مدینہ'' کے نام سے مشہور ہے اور دُنیا کا پہلا تحریری دستور ہے۔ اس کے چند اہم پہلوؤں کا خلاصہ یہ ہے۔

1- مدینے کے اس منظم معاشرے میں خدا کے قانون کو بنیادی حیثیت حاصل ہوگی۔
2- سیاسی، قانونی اور عدالتی لحاظ سے آخری اختیار حضور صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کے پاس ہوگا۔

3- دفاعی لحاظ سے مدینہ اوراس کے نواح کی آبادی ایک متحدہ طاقت ہوگی اور بیرونی حملے کی صورت میں وہ متحد ہو کر اس کا مقابلہ کریں گے۔

4- انصار و یہود میں سے کوئی بھی قریش کو پناہ نہ دے گا۔

اس معاہدے سے باضابطہ طور پر اسلامی ریاست اور اسلامی نظامِ حیات کی بنیاد رکھ دی گئی۔

مخالفتِ یہود:

یہود مدینہ سے صلح وامن کا معاہدہ تو طے پا گیا اور یہود نے اسلام کو ایک الگ قوت بھی تسلیم کر لیا' لیکن اسلام کی روز افزوں ترقی ان کے لیے مستقل پریشانی بن گئی تھی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ تورات کی پیشین گوئیوں کے مطابق وہ ایک نئے نبیؐ کے ظہور کے ساتھ ہی اس پر ایمان لے آتے لیکن یہی لوگ مدینے میں حضورؐ اور ان کے ساتھیوں کے خلاف صف آراء ہو گئے۔ یہودی پیشواؤں نے تورات کی تعلیم کو اپنے مفاد کی خاطر بدل ڈالا تھا اور اب مذہب ان کے لیے ایک نفع بخش کاروبار تھا۔ اشاعتِ اسلام سے چونکہ ان کی مذہبی اجارہ داری اور اہلِ مدینہ پر ان کا اثر ورسوخ خطرے میں پڑ گیا تھا' اس لیے کھلم کھلا تصادم کی بجائے یہود نے مکاری اور عیاری سے حضورؐ کی مخالفت پر کمر باندھ لی۔ نفاق اور سازش ان کی مخالفت کے دو بڑے حربے تھے۔ مکہ میں صرف دو گروہ تھے۔ مسلمان اور کافر لیکن مدینے میں مسلمانوں اور کافروں کے درمیان ایک تیسرا گروہ منافقوں کا بھی تھا۔

مسلمان آغازِ اسلام میں بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ یہودیوں کو اس پر فخر تھا۔ لیکن جب اسلام نے قبلہ بدل دیا تو وہ بہت برہم ہوئے اور بہت سے یہودی جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے لیکن درحقیقت مسلمانوں کے لیے مارِ آستین تھے' ان کی منافقت کا راز فاش ہو گیا۔

حضورؐ کو متعدد مسائل درپیش تھے۔ مسلسل آنے والے مہاجرین کی بحالی' قریشِ مکہ کی طرف سے ہر لحظہ حملے کا خطرہ اور مدینے کا دفاع اور ان سب سے بڑی مشکل یہ کہ مدینے کی نئی ریاست میں غداروں اور سازشیوں کی ایک بڑی تعداد فتنہ برپا کر رہی تھی۔ یہودیوں نے اولاً شرانگیزی سے کام لیا۔ پھر تخریبی کارروائیاں کیں حتیٰ کہ غداری سے کام لیا اور کفار ومشرکین کو اپنا عملی تعاون پیش کر دیا۔

یہود نے حضورؐ اور مسلمانوں پر پھبتیاں کسیں۔ مذاق اڑائے' پروپیگنڈے کے طوفان اُٹھائے' مخبریاں اور جاسوسیاں کیں' نت نئے سوالات اور اعتراضات کیے۔ مسلمانوں کو ایک دوسرے سے لڑانے کے منصوبے تیار کیے' رحمت عالمؐ کے قتل کی تدبیریں کیں اور جنگ اور ہنگامی حالات میں سخت قسم کی غداریاں کیں لیکن حضورؐ ان کی مخالفتوں سے بے پرواہ ہو کر تبلیغِ شریعت اور فریضۂ رسالت کے اہم کام میں شب و روز مصروف رہے اور اللہ پر توکّل کرتے ہوئے اپنا کام جاری رکھا۔

دفاعی جنگیں:

آنحضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم مکے سے جب چلے تو چند ہی دنوں کے بعد قریش نے عبداللہ بن اُبی کو جو ہجرت سے قبل انصار کا سردار تھا' خط لکھا کہ ''تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی ہے۔ ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ یا تو تم لوگ اس کو قتل کر ڈالو یا مدینہ سے نکال دو ورنہ

ہم سب تم پر حملے کر کے تمھیں فنا کر دیں گے"۔قریش اس قسم کی دھمکیاں دیتے رہتے تھے۔کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وا لہٖ وسلم کا مکے سے بچ نکلنا انھیں سخت نا گوار تھا۔

قریش خانہ کعبہ کے مجاور تھے اور اس وجہ سے تمام عرب ان کا احترام کرتے تھے۔ مکے سے مدینے تک کے قبائل ان کے زیر اثر تھے۔قریش نے انھیں بھی اسلام کا مخالف بنا دیا تھا۔یہ لوگ نہ صرف اسلام کی اشاعت میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے بلکہ مدینے کے لیے ایک مسلسل خطرہ تھے۔حضورؐ اس خطرے کے پیش نظر راتوں کو اکثر جاگا کرتے۔تمام عرب حضورؐ اور ان کے ساتھیوں سے لڑنے پر آمادہ تھے۔حتیٰ کہ صحابہؓ رات کو ہتھیار لگا کر سوتے لیکن اللہ تعالیٰ نے ابھی جنگ کی اجازت نہ دی تھی۔

2ھ میں راہِ خدا میں صرف ان لوگوں سے لڑنے کی اجازت ملی جو مسلمانوں سے لڑنے کے لیے آئیں۔حقیقت بھی یہی ہے کہ مدینے میں حضورؐ کا سب سے پہلا کام اپنی حفاظت کی تدبیر تھی۔کیونکہ قریش نے مدینے کی بر ادی کا فیصلہ کر لیا تھا اور تمام قبائل میں یہ آگ بھڑک اُٹھی تھی۔حضور صلی اللہ علیہ وا لہٖ وسلم نے غزوۂ بدر سے قبل جتنی مہمیں نواحِ مدینہ میں روانہ کیں' ان کا مقصد قریش کی نقل و حرکت کا پتہ لگانا اور آس پاس کے قبائل سے امن و اتحاد کے معاہدے کرنا تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وا لہٖ وسلم امن کا درس دینے کے لیے دُنیا میں تشریف لائے تھے لیکن دشمنانِ اسلام نے آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ہجرت کے بعد مسلمانوں کی اجتماعی قوت میں اضافہ ہوا تو مشرکین مکہ کی آتشِ عداوت بھڑک اُٹھی۔چنانچہ ابتداءً کرز بن جابر فہری رئیسِ مکہ نے مدینے کی چراگاہ پر حملہ کر کے آنحضورؐ کے مویشی لوٹ لیے اور بچ کر نکل گیا۔چند روز بعد عمرو بن الحضرمی مسلمانوں کے ساتھ ایک جھڑپ میں مارا گیا جس نے قریش کو مدینے پر فوری حملے کا موقع فراہم کر دیا۔ایک طرف مخلص مسلمانوں کی مختصر جماعت' سامانِ جنگ کی کمی اور بے سروسامانی' اور دوسری طرف قریشِ مکہ پورے ساز و سامان کے ساتھ مسلح۔بدر کے میدان میں دونوں جماعتوں نے ڈیرے ڈال دیئے۔حضورؐ پر خشوع وخضوع کی حالت طاری تھی۔دونوں ہاتھ پھیلا کر بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتے "خدایا! تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے' آج پورا کر"۔محویت اور بے خودی کی حالت میں کبھی سجدے میں گرتے اور گڑ گڑاتے حتیٰ کہ لب مبارک فتح کی پیشین گوئی سے آشنا ہوئے۔

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَo (القمر 45:54) فوج کو شکست دی جائے گی اور وہ پیٹھ پھیر دیں گے۔

بدر کا معرکہ ایثار اور جانبازی کا معرکہ تھا۔فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو لوگوں نے دیکھا کہ خود ان کے جگر کے ٹکڑے تلوار کے سامنے ہیں لیکن حضورؐ کی محبت اور دینِ اسلام کی لگن ان سب پر بھاری تھی۔حق غالب آیا' کفر کی کمر ٹوٹ گئی۔قریش کے ستر معتبر اور معزز اشخاص قید ہوئے اور انھیں چھڑانے کے لیے قریش نے مدینے میں آمدورفت شروع کی۔مسلمانوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا۔قرآن کی آواز کانوں میں پڑی اور پتھر دل موم ہو گئے۔فتحِ بدر مسلمانوں کی ترقی کا پہلا قدم تھا۔قریش کے تمام مخالفِ اسلام سردار اس جنگ میں مارے گئے تھے۔

اس فتح نے مسلمانوں کے خلاف یہودیوں کے جذبۂ حسد کو بڑھا دیا۔گویا مدینے میں اسلام کی مخالفت میں اضافہ ہو گیا۔

مقتولینِ بدر کا انتقام لینے کے لیے اُحد کا معرکہ ہوا اور یہود مدینہ نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے قریشِ مکہ کا در پردہ ساتھ

دیا۔کوہ اُحد کے دامن میں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ یہ جنگ حضورؐ اوران کے ساتھیوں کے لیے سخت آزمائش کی جنگ تھی۔مسلمانوں کے ستر آدمی شہید ہوئے۔حضورؐ کے دندان اور چہرہ مبارک پر زخم آئے لیکن آپؐ کے عزم واستقلال میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔کفار ہر طرف سے ہٹ کر آپؐ پر ہجوم کرتے لیکن ذوالفقار کی بجلی سے یہ بادل چھٹ چھٹ کر رہ جاتا تھا۔

مدینے میں حضورؐ کے زخمی ہونے کی خبر پہنچی تو لوگ نہایت بے تابی سے دوڑے۔ جناب فاطمۃ الزہرؓا نے دیکھا کہ چہرۂ مبارک سے خون جاری ہے۔حضرت علیؓ سپر میں پانی بھر کر لائے۔ جناب سیدہؓ دھوتی تھیں لیکن خون نہ تھمتا تھا۔آخر چٹائی کا ٹکڑا جلا کر زخم پر رکھا تو خون تھما۔

خواتینِ قریش نے انتقامِ بدر کے جوش میں مسلمانوں کی لاشوں سے بھی بدلہ لیا اوران کے ناک کان تک کاٹ دیئے۔

مسلمان عورتوں نے بھی اس جنگ میں حصہ لیا۔وہ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں اور فوجیوں کو پانی پلاتی تھیں۔

یہودیوں کا قلع قمع:

یہود مدینہ نے معاہدۂ امن کے باوجود مسلمانوں سے غداری کی تھی۔اس لیے ان کی سرکوبی نہایت ضروری تھی۔2ھ سے 4ھ تک ان کے خلاف جولڑائیاں لڑی گئیں وہ غزوات بنونضیر، بنوقینقاع اور بنوقریظہ کے نام سے مشہور ہیں۔جن میں غدار یہودیوں کو قتل یا جلاوطن کر دیا گیا۔ان کی جائیدادوں کو ضبط اوران کے قلعوں کو مسمار کر دیا گیا تا کہ ان کی مکاریوں اور عیاریوں کا خاتمہ ہو جائے۔آخر کار غزوۂ خیبر کے بعد ان کی سیاسی قوت بھی ختم ہوگئی۔

اسلام کے خلاف عرب کی متحدہ جنگ:

5ھ میں قبائلِ قریش، کنانہ،غطفان، اسداورکئی دوسرے قبائل نے متحد ہو کر مدینے پر حملہ کیا۔مسلمانوں نے مدینے کے گرد خندق کھود کر شہر کا دفاع کیا اور محصور ہو گئے۔ یہ محاصرہ اس قدر شدید تھا کہ حضورؐ اوران کے ساتھیوں پر تین تین دن فاقے گزر گئے۔آخر اللہ تعالیٰ کی مدد سے مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی اور کفار کو مجبور ہو کر بھاگ جانا پڑا۔اس جنگ کا نام غزوۂ خندق یا احزاب ہے۔اس جنگ میں شکست سے قریش کی متحدہ قوت کا زور ٹوٹ گیا اور بہت سے قبائل جو قریش کے زیر اثر تھے، مسلمان ہو گئے۔

عہد نامہ حدیبیہ:

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قریشِ مکہ کے خلاف مجبوراً تلوار اُٹھائی تھی تا کہ اسلام کی تبلیغ کو آزادی ملے۔ چھ برس کی مسلسل جدوجہد کے بعد قریش نے اسلام کے اس حق کو تسلیم کر لیا اور حدیبیہ کا عہد نامہ طے پایا جس کے بعد آزادانہ میل جول سے منکروں کو مسلمانوں کے اخلاق وعادات کا تجربہ ہوا۔نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے قبل غزوات کے باوجود جس قدر لوگ اسلام لائے تھے صرف دو ہی برس میں یہ تعداد کئی گنا بڑھ گئی۔صلح حدیبیہ کے سال حضورؐ عمرے کے ارادے سے مدینے سے نکلے تو صرف ڈیڑھ ہزار افراد ساتھ تھے۔دو برس کے بعد فتح مکہ کے لیے چلے تو دس ہزار مسلمانوں کا لشکر ساتھ تھا۔

شاہانِ روم وعجم کو دعوت اسلام:

عہد نامۂ حدیبیہ کے بعد عرب اور عرب سے باہر اسلام کے مبلغ اور قاصد بھیجے گئے۔ دُنیا کے بادشاہوں کو دعوتِ اسلام دی گئی۔ ایران، حبش اور روم والے آپؐ کی تعلیم سے فیض یاب ہوئے۔ مشرکینِ عرب، یہودی اور عیسائیوں نے بھی آپؐ کے زمانے ہی میں آپؐ کے نور سے روشنی حاصل کی۔

حجاز سے باہر، نبوت کے بیس برس میں، قریش اور یہود کی مزاحمت کی وجہ سے اسلام آگے نہ بڑھ سکا اور خال خال مسلمان ادھر ادھر نظر آتے تھے۔ ان دیواروں کا ہٹنا تھا کہ صرف تین برس یعنی 8ھ، 9ھ اور 10ھ میں اسلام کا اثر ایک طرف یمن، بحرین، یمامہ، عمان اور دوسری طرف عراق اور شام کی حدود تک وسیع ہو گیا۔

اصل بات یہ ہے کہ تمام ملک قریشِ مکہ کے فیصلے کا انتظار کر رہا تھا۔ مکہ فتح ہو گیا تو یہ انتظار بھی ختم ہو گیا اور رفتہ رفتہ پورا عرب مسلمان ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب 10ھ میں حجۃ الوداع کے لیے نکلے تو اسلام کی آواز ہر طرف پھیل چکی تھی۔

اختتام فرض نبوت یعنی خطبہ حجۃ الوداع

ہجرت سے اب تک آپؐ نے حج ادا نہ فرمایا تھا۔ آپؐ کو معلوم ہو چکا تھا کہ رحلت کا زمانہ قریب آ گیا ہے۔ اب ضرورت تھی کہ تمام دُنیا کے سامنے شریعت، اخلاق اور حکومت کے تمام بنیادی اصولوں کا مجمع عام میں اعلان کر دیا جائے۔ حج کا اعلان ہوتے ہی ہم رکابی کے لیے پورا عرب اُمنڈ آیا اور آگے پیچھے، دائیں بائیں جہاں تک نظر کام کرتی تھی آدمیوں کا ہجوم نظر آتا تھا۔ مدینے سے مکہ کا سفر دنوں میں طے ہوا اور چار ذوالحجہ کو آپؐ مکہ معظّمہ میں داخل ہوئے اور رسومِ حج ادا کرنے کے بعد نویں ذوالحجہ کو میدانِ عرفات میں ناقہ پر سوار ہو کر وہ مشہور خطبہ (خطبۃ الوداع) دیا جو تمام اسلامی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔ اور جس کا موضوع حج کی برکت، کعبہ کی حرمت مسلمانوں کے مال وخون وآبرو کی حفاظت، عورتوں کے حقوق، غلاموں کے ساتھ مساوی سلوک اسلامی برادری اور اتحاد تھا۔

تکمیلِ شریعت اور اسلامی حکومت کا قیام

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکے اور پھر مدینے میں وحی الٰہی کی راہنمائی میں جو افراد تیار کیے اور پھر ان سے جو بہترین جماعت تیار ہوئی وہ حکومت اسلامی کے قیام کا پیش خیمہ تھی۔ مدینے میں حضورؐ نے تبلیغ اسلام اور قیام امن کے لیے جو طرزِ عمل اختیار کیا اس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ آپؐ شریعت اسلامی کی تکمیل کے ساتھ ساتھ اسلامی حکومت کے قیام کے لیے بھی اس دُنیا میں تشریف فرما ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسلامی حکومت کے قیام کو اسلامی احکام کے نفاذ کے لیے ضروری قرار دیا ہے اور اسلام کی حکومت کی غرض وغایت کو ان الفاظ

میں بیان فرمایا ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ط
(الحج 42:22)

جنھیں ہم اگر زمین میں قوت عطا کریں تو نماز قائم کریں۔ مستحقین کی مالی مدد کریں (زکوٰۃ دیں) لوگوں کو نیکی کی تاکید کریں اور برائی سے روکیں۔

یعنی ایک منظّم اور باقاعدہ اسلامی حکومت کا وجود اس لیے ضروری تھا کہ ملک میں امن وامان پیدا ہو اور اسلام بلا روک ٹوک پھل پھول سکے اور مسلمان بغیر کسی مزاحمت کے مذہبی فرائض انجام دے سکیں۔

ہجرت سے آٹھ برس کا تمام زمانہ فتنوں کو فرو کرنے ' مخالفوں کے ہنگاموں کی مدافعت اور ملک میں امن وامان قائم کرنے میں گزر گیا۔ اس لیے ان آٹھ برسوں میں فرائضِ اسلام میں جو چیز سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ صرف ''جہاد'' ہے۔ جہاد کے ساتھ ساتھ باقی فرائض بتدریج فرض ہوئے۔

ملکی قانون سے متعلق احکام اس وقت نازل ہوئے جب اسلام ایک حکمران طاقت بن گیا۔ یہ احکام بتدریج نازل ہوئے اس لیے کہ عربوں کو محض احکام بتا دینا ہی مقصد نہ تھا بلکہ ان پر عمل بھی کرانا تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللّٰہ عنھا کا بیان ہے کہ ''پہلے عذاب وثواب کی آیات نازل ہوئیں۔ جب دل میں استعداد پیدا ہوگئی تو احکام نازل ہوئے ورنہ اگر پہلے ہی یہ حکم ہوتا کہ شراب نہ پیو تو کون مانتا۔''

آنحضور صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم کی مکی زندگی اور مدنی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ آپؐ اللّٰہ کے آخری پیغام کو انسانوں تک پہنچانے اور اس کی روشنی میں مثالی معاشرہ اور اسلامی حکومت قائم کرنے کی غرض سے مبعوث ہوئے تھے۔

بعثت کے بعد مکے میں دعوتِ اسلام' مخالفتوں کے باوجود عزم واستقلال کا مظاہرہ' ہجرتِ مدینہ' انصار ومہاجرین میں رشتہ مواخات' میثاقِ مدینہ' غزوات' صلح حدیبیہ' سلاطین کو دعوتِ اسلام' فتح مکہ' جزیرہ عرب کے مختلف علاقوں میں قاضیوں کا تقرر اور حجۃ الوداع میں اہم تعلیماتِ اسلام کا اعلان آپؐ کے مشن کے مختلف حصے ہیں۔

آپؐ نے نہ صرف اعتقادات وعبادات کی طرف توجہ دی بلکہ زندگی کے تمام مسائل کو سلجھایا۔ خواہ ان کا تعلق اعتقادات سے ہو یا عبادات سے۔ معاملات سے ہو یا اخلاق سے۔ معیشت سے ہو یا سیاست سے۔ یہاں تک کہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے متعلق کتاب وسنت میں تعلیم موجود نہ ہو۔

آپؐ نے نیکی کی صرف تعلیم ہی نہیں دی بلکہ خود اس پر عمل کر کے دکھلایا اور ایسے پاکباز ساتھی پیدا کیے کہ تاریخِ عالم میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ آپؐ کی تعلیمات کو پانچ اہم شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ وہ ہیں اعتقادات' عبادات' معاملات' اخلاق اور حلال وحرام' ہر شعبے کے متعلق جو کچھ فرما دیا وہ حرفِ آخر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا۔

ختمِ نبوت

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝

(لوگو!) محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں مگر وہ اللہ کے پیغمبر اور ''خاتم الانبیاء'' ہیں اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

(الاحزاب 40:33)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام نبیوںؑ اور رسولوںؑ کے آخر میں تشریف لائے۔ نبوت و رسالت کا جو سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک پہنچا تھا وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم ہو گیا۔ گزشتہ انبیاؑ کی تبلیغ و ہدایت اور نبوت و رسالت ایک علاقے یا ملک تک محدود رہی۔ انھوں نے کبھی عالمگیر دعوت و پیغام کا دعویٰ نہیں کیا لیکن آپؐ کا پیغام عالمگیر تھا اور آپؐ کی مخاطب پوری دُنیا تھی۔ آپؐ پوری کائنات کے لیے ''بشیر'' اور ''نذیر'' بن کر تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام مکمل اور محفوظ شکل میں تمام دُنیا کے انسانوں کی ہدایت کے لیے باقی چھوڑا اور کسی نئے نبی یا رسول کے آنے کی ضرورت کو ختم کر دیا۔ اس لیے قرآن حکیم نے آپؐ کو ''خاتم النبیّن'' کہا۔ عربی زبان میں ''خاتم'' کا معنیٰ اس مہر کے ہیں جو لفافے پر اس لیے لگائی جاتی ہے کہ اس میں کوئی کمی بیشی نہ کی جا سکے۔ اس لیے آپؐ کے آنے سے نبوت و رسالت کا سلسلہ سر بہ مہر ہو گیا اور آپؐ کے بعد اب کوئی نبی نہ آئے گا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی گواہی خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ کہہ کر دی:

''میری اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے مکان بنایا اور اسے مکمل کر لیا مگر ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی۔ پس میں قصرِ نبوت کی وہی آخری اینٹ ہوں جس نے اس کی تکمیل کر دی۔ سن لیجیے میرے بعد کوئی نبی نہ ہو گا''۔

حق تعالیٰ نے دینِ اسلام کو حدِّ کمال تک پہنچا کر دین کی تکمیل کا اعلان فرما دیا:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ

آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت (نبوت و رسالت) کو پورا کر دیا۔

(المائدہ 3:5)

حضور خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے بہت سے انبیا آئے، لیکن دُنیا آج ان میں سے اکثر کے ناموں سے بھی واقف نہیں۔ قرآن مجید سے پہلے بہت سی کتابیں نازل ہوئیں لیکن آج ان میں سے کوئی بھی اپنی اصل صورت میں باقی نہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی کتاب کا ایک ایک حرف محفوظ ہے اور آپؐ کی زندگی کا ہر پہلو روزِ روشن کی طرح صاف اور واضح ہے۔

اللّٰہ کا قانون ہے کہ جس چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی وہ مٹا دی جاتی ہے اور جس شے کی ضرورت ہوتی ہے وہ باقی رکھی جاتی ہے اور اسے مٹنے سے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ آپؐ کی شریعت کو باقی رکھا گیا اور آپؐ سے پہلے کی شریعتیں یا تو مٹ گئیں یا ان میں اس قدر ردوبدل ہو گیا کہ وہ اپنی اصل صورت میں اب موجود نہیں لیکن آپؐ کی شریعت محفوظ ہے اور قرآن حکیم کے الفاظ میں ذرہ برابر ردوبدل نہیں ہوا۔ اس کی حفاظت خود حق تعالیٰ کے ذمے ہے۔ اس لیے یہ قیامت تک محفوظ ہے اور آنحضور صلی اللّٰہ علیہ والہ وسلم قیامت تک کے لیے نبی اور رسول ہیں۔

آپؐ کا فرمان ہے:

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ. میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔

....

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پاکیزہ کردار

عہد طفولیت

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قریباً پونے چھے سو سال بعد ایسے ماحول میں ہوئی کہ دُنیا پیغمبروں کے پیغامِ حق کو فراموش کر چکی تھی۔ اللہ کی عبادت کی جگہ کائنات مظاہر پرستی میں مبتلا تھی۔ کسی نے انسان کو خدا بنا رکھا تھا تو کوئی اسے خدا کا بیٹا سمجھے بیٹھا تھا۔ سورج کی پرستش، چاند تاروں کی پوجا، حیوانوں، درختوں اور پتھروں کی عبادت کی جاتی تھی۔ کوئی ذات عبادت کے لائق نہ سمجھی جاتی تھی تو وہ صرف خدائے واحد کی ذات تھی۔ اگر خالقِ حقیقی کی کہیں پرستش کی جاتی تھی تو وہ بھی مظاہر کے ذریعے۔ حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس قوم میں پیدا ہوئے وہ زیادہ تر بت پرست تھی اور بتوں کی پرستش کو خدا کی قربت کا ذریعہ سمجھتی تھی۔ ان کا کہنا تھا:

مَا نَعْبُدُ هُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْ نَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ط   ہم ان (بتوں) کو صرف اس لیے پُوجتے ہیں کہ وہ خدا کے ہاں ہماری قربت کا ذریعہ بن جائیں۔ (الزمر 3:39)

یہ حالت ان کے شرک کی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے ہاں باپ کی منکوحہ بیٹے کو وراثت میں ملتی تھی۔ دو حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ شادی جائز تھی۔ بیویوں کی حد نہ تھی۔ بے حیائی، شراب خوری، جواء اور زنا کا عام رواج تھا۔ لڑائیوں میں لوگوں کو زندہ جلا دینا، مستورات کے پیٹ چاک کر دینا اور لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا عموماً درست سمجھا جاتا تھا۔

یہی وہ تاریک دور تھا جس میں آفتابِ ہدایت طلوع ہوا۔ آپؐ کی ولادت مبارک بارہ یا نو ربیع الاول مطابق 20 اپریل 571ء کو ہوئی۔ آپؐ کے والد ماجد کا نام عبداللہ اور والدۂ ماجدہ کا نام حضرت آمنہ تھا۔ آپؐ کے والد ماجد آپؐ کی ولادت سے کچھ ماہ پہلے انتقال کر چکے تھے۔ آپؐ کے دادا جناب عبدالمطلب نے آپؐ کا نام "محمدؐ" رکھا۔

آپؐ کی ولادت کے متعلق آپؐ کی والدۂ ماجدہ کی زبانی جو روایات سیرت کی مستند کتابوں میں ملتی ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ آپؐ کی ولادت عام بچوں کی طرح نہیں ہوئی۔ آپؐ جس وقت کائنات میں تشریف لائے تو دور دراز تک روشنی ہی روشنی نظر آتی تھی۔ آپؐ ہر قسم کے میل کچیل سے پاک پیدا ہوئے۔ جب آپؐ کے دادا کو آپؐ کی پیدائش کی خبر ملی تو وہ گھر تشریف لائے اور اپنے پوتے کو گود میں لے کر اللہ کا شکر ادا کیا اور "محمدؐ" نام رکھا۔

شرفائے عرب میں دستور تھا کہ وہ اپنے بچوں کو شہر سے باہر دیہات میں پرورش کی خاطر بھیجا کرتے تھے تاکہ بچے صحت مند ماحول میں پلیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اسی غرض سے حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے ہاں چار سال کا عرصہ رہے۔ حضرت حلیمہؓ کی زبانی آپؐ کے بچپن کے عجیب و غریب واقعات تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں مذکور ہیں جنھیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپؐ کا بچپن عام بچوں کا سا بچپن نہ تھا۔ آپؐ عام بچوں کی طرح کھانے پینے کی چیزوں کی طرف کوئی توجہ نہ دیتے۔ چھوٹے بچے عموماً بلاوجہ روتے ہیں مگر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم اس عادت سے پاک تھے۔ چار سال کے عرصے میں حضرت حلیمہؓ نے آپؐ کی وجہ سے اللہ کی بے پناہ مہربانیوں کا مشاہدہ کیا۔

آپؐ کے دادا جناب عبدالمطلب آپؐ سے بے حد محبت کرتے تھے۔ قریش کے سردار ہونے کی وجہ سے آپ کی بڑی عزت تھی۔ جب آپ حرم کعبہ یا دارالندوہ میں تشریف لاتے تو اپنے دُرِّ یتیم کو بھی ساتھ لاتے اور اپنی دائیں جانب بٹھاتے۔ آپؐ میں عام بچوں کی سی عادات نہ تھیں۔ آپؐ کم عمری کے باوجود بچپن میں بڑی سنجیدگی اور آرام سے بیٹھتے اور عظمت وشرافت کے آثار آپؐ کی ہر ادا سے ظاہر ہوتے۔

آٹھ سال کی عمر میں آپؐ کے دادا دُنیا سے رخصت ہو گئے اور اپنے بیٹے جناب ابوطالب کو آپؐ کی پرورش کی وصیت کر گئے۔

جناب ابوطالب اگرچہ بڑے کنبے کے مالک تھے تاہم انھوں نے اپنے پیارے بھتیجے کی پرورش کا حق ادا کیا۔ وہ آپؐ کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے اور اپنے بچوں سے بڑھ کر آپؐ سے محبت کرتے۔ آپؐ نے دس بارہ سال کی عمر میں بکریاں بھی چرائیں۔ بکریاں چرانا اُس زمانے میں کوئی معیوب کام نہ تھا۔ شرفاء کے بچے عموماً یہ کام کیا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ دُنیا کی گلہ بانی کا فریضہ آپؐ کے سپرد ہونا تھا' اس لیے خداوند عالم عہد طفولیت سے آپؐ کو اس کام کے لیے تیار کر رہا تھا تاکہ صبر وحلم کی اعلیٰ صفات درجہ کمال کو پہنچیں اور بعثت کے بعد آپؐ ہر قسم کے انسانوں کی رہنمائی کا کام بطریقِ احسن انجام دے سکیں۔

عہدِ شباب

رحمتِ عالمؐ کا مقام اس لحاظ سے یگانہ اور منفرد ہے کہ نبوت سے قبل آپؐ نے اپنی عمر کے پورے چالیس برس اپنی قوم میں گزارے۔ آپؐ کی زندگی کے شب وروز آپؐ کی قوم کے سامنے روزِ روشن کی طرح عیاں تھے۔ آپؐ کی یہ چالیس سالہ زندگی صداقت' دیانت اور خدمتِ خلق کی ایک مسلسل کہانی ہے۔ آپؐ نے جب نبوت کا اعلان کیا تو اپنی اس چالیس سالہ زندگی کو ہی اپنی سچائی کے ثبوت میں پیش کیا۔ آپؐ کے بڑے سے بڑے دشمن کو بھی یہ ہمت نہ ہوسکی کہ آپؐ کی سابقہ زندگی پر انگلی اٹھائے۔ آپؐ کا سب سے بڑا دشمن ابوجہل کہا کرتا تھا ''محمدؐ! میں تمھیں جھوٹا نہیں کہتا۔ میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ بتوں کی بددُعا نے تمھیں دیوانہ بنا دیا ہے''۔

صادق وامین تاجر:

آپؐ کا خاندان چونکہ تجارت پیشہ تھا۔ اس لیے آپؐ بھی اس طرف مائل ہوئے۔ آپؐ کے چچا ابوطالب بھی تاجر تھے۔ جب آپؐ سنِ رُشد کو پہنچے اور فکرِ معاش کی طرف توجہ ہوئی تو آپؐ کو تجارت سے بہتر کوئی پیشہ نظر نہ آیا۔

کامیاب تجارت کا سب سے بڑا گر نیک نامی اور ساکھ ہے۔ آپؐ پر لوگوں کے اعتماد کا یہ عالم تھا کہ بے کھٹکے اپنی رقوم آپؐ کے پاس امانت رکھتے۔

ان دنوں لوگوں کا دستور تھا کہ اپنا سرمایہ کسی تجربہ کار اور امین شخص کے ہاتھ میں دیتے اور تجارت کے منافع میں شرکت کر لیتے تھے۔ آپؐ بھی اس طریق شراکت سے تجارت کیا کرتے تھے۔

وہ لوگ جو آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ شریکِ حیات رہے' گواہی دیتے تھے کہ آپؐ بڑی دیانت داری اور راست بازی کے ساتھ اس کام کو انجام دیتے تھے۔

کاروبار تجارت میں آپؐ اپنا معاملہ ہمیشہ صاف رکھتے اور کبھی وعدہ خلافی نہ فرماتے۔ چنانچہ آپؐ کی دیانت کی وجہ ہی سے ہر چھوٹا بڑا آپؐ کو ''الامین'' (شک وشبہ سے بالا دیانتدار) اور ''الصادق'' (بے مثال صداقت کا پیکر) کہہ کر پکارتا۔

حربِ فجار:

آپؐ کے عہد شباب میں حرب فجار کا واقعہ پیش آیا۔ یہ جنگ قبیلہ قریش اور قبیلہ قیس کے درمیان لڑی گئی۔ قریش کے حق پر ہونے کی وجہ سے آپؐ اپنے خاندان کے ساتھ رہے۔ مگر عملی طور پر کوئی حصہ نہ لیا چونکہ یہ جنگ ان ایام میں لڑی گی تھی جن میں جنگ و جدل حرام تھا' اس لیے حرب فجار کہلائی اور حضورؐ نے بھی عملی طور پر حصہ لینے سے اجتناب فرمایا۔

حضور صلی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلم کا جی اس قسم کی لڑائیوں کو دیکھ کر سخت کڑھتا تھا اور آپؐ چاہتے تھے کہ جاہلیت کے دور کی یہ لڑائیاں ختم ہوں چنانچہ اسی سلسلے میں جب ''حلف الفضول'' کا مشہور معاہدہ طے پایا' جس میں فیصلہ کیا گیا کہ ''ظالم کی مخالفت اور مظلوم کی مدد کی جائے گی'' تو آپؐ دل و جان سے اس میں شریک ہوئے۔ آپؐ عہد نبوت میں بھی فرمایا کرتے تھے کہ ''اس معاہدے کے مقابلے میں اگر مجھے سرخ اُونٹ بھی دیئے جاتے تو میں نہ لیتا' اور آج بھی ایسے معاہدے کے لیے کوئی بلائے تو میں حاضر ہوں۔

واقعۂ حجرِ اسود:

آپؐ کے اعلیٰ کردار' تدبّر اور معاملہ فہمی کا مظاہرہ ہمیں تعمیر کعبہ کے وقت نظر آتا ہے۔ کعبہ شریف چونکہ نشیبی علاقے میں تھا اس لیے اکثر بارشوں کی وجہ سے عمارت کو نقصان پہنچتا تھا۔ قریش نے فیصلہ کیا کہ کعبے کی از سرِ نو تعمیر کی جائے۔

تعمیر کا کام شروع ہوا اور تمام قبائل قریش نے پوری عقیدت سے اس میں حصہ لیا۔ جب حجر اسود کے نصب کرنے کا موقع آیا تو سخت جھگڑا پیدا ہو گیا۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ یہ سعادت اسے حاصل ہو۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ لڑائی کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ آخر خاندان کے ایک معمر شخص ابوامیہ بن مغیرہ کی رائے پر فیصلہ ہوا کہ کل صبح جو شخص پہلے داخل ہو' وہی ثالث قرار دے دیا جائے۔ حکم الٰہی سے آنحضور صلی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلم پہلے تشریف لائے۔ آپؐ کو دیکھتے ہی سب پکار اُٹھے ''الامین'' تشریف لائے۔ ہمیں ان کا فیصلہ منظور ہے۔ آپؐ نے جس حُسنِ تدبّر کا ثبوت دیتے ہوئے حجر اسود کو نصب فرمایا' اس کا مفصل تذکرہ آپ گزشتہ جماعتوں میں پڑھ چکے ہیں۔

حیا:

آپؐ کی خوبیاں اتنی ہیں کہ شمار میں نہیں آسکتیں۔ لیکن جوانی میں شرم و حیا آپؐ کی سب سے نمایاں صفت تھی۔ کسی نے آپؐ کو ننگا نہیں دیکھا۔ بچپن میں بھی آپؐ حیا کا پیکر تھے۔ خودداری کا یہ عالم تھا کہ اپنی روزی خود کمائی اور کسی پر بوجھ نہیں بنے۔

محبت ورحمت کا پیکر:

قرآن حکیم نے آپؐ کو ''رحمتہ للعالمین'' کہا ہے۔ نبوت سے قبل بھی آپؐ محبت ورحمت کی تصویر تھے۔ کسی کو تکلیف میں دیکھتے تو جھٹ بے چین ہو جاتے اور اس وقت تک آرام نہ فرماتے جب تک اس کی تکلیف دور نہ ہو جاتی۔

آپؐ اپنے وقت کا کافی حصہ بوڑھوں، بیماروں اور معذور لوگوں کی دیکھ بھال میں صرف کرتے۔ ان کے چھوٹے موٹے کام کر دیتے۔ ان کا سودا سلف لا دیتے۔ آپؐ کے دل میں غلاموں کے لیے خاص جگہ تھی۔ یتیموں کے ساتھ بے حد محبت سے پیش آتے اور بچوں سے محبت و شفقت کا سلوک کرتے۔ غریب بچوں کو کھانا کھلاتے اور پہننے کے لیے کپڑے دیتے۔

مراسمِ شرک سے اجتناب:

آپؐ بچپن اور جوانی میں بھی جبکہ آپؐ نے ابھی نبوت کا اعلان نہیں فرمایا تھا، مشرکانہ رسوم سے بچتے۔ ایک دفعہ قریش نے آپؐ کے سامنے کھانا لا کر رکھا جو بتوں کے چڑھاوے کا تھا۔ آپؐ نے اسے کھانے سے انکار کر دیا۔ ایامِ حج میں قریش نے یہ قاعدہ بنا دیا تھا کہ جو لوگ باہر سے آئیں وہ طواف کے وقت قریش کا لباس پہنیں ورنہ برہنہ طواف کرنا ہوگا۔ چنانچہ اس بنا پر عریاں طواف کا عام رواج ہو گیا تھا۔ لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس بارے میں کبھی اپنے خاندان کا ساتھ نہ دیا بلکہ ہمیشہ اس بُری رسم کی مخالفت کی۔

مکے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو معاشرتی زندگی کی لغویات اور ناانصافیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بتوں کی پوجا، میلوں ٹھیلوں کا رواج، شراب اور جوا، غرض کون سی بے حیائی تھی جو اہلِ مکہ میں نہ تھی۔ نسب اور خاندان پر فخر و غرور کا یہ حال تھا کہ بات بات پر تلواریں نکل آتی تھیں۔ یہ جھگڑے پشتوں تک چلتے۔ لڑکیوں کو بدنامی کا باعث سمجھ کر زندہ دفن کر دیا جاتا اور پھر ان برائیوں اور بے حیائی کے کاموں کا ذکر بھری محفلوں میں بڑے فخر سے کیا جاتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان معاشرتی بُرائیوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتے۔ آپؐ خود ان سے دُور رہتے اور سوچتے رہتے کہ ان بُرائیوں سے لوگوں کو کس طرح بچایا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے خیالات ہر وقت آپؐ کے ذہن مبارک پر چھائے رہتے۔ یہاں تک کہ آپؐ خلوت پسندی اور تنہائی کی طرف مائل ہو گئے اور غارِ حرا میں آپؐ کے شب و روز بسر ہونے لگے۔ غارِ حرا مکّے سے کوئی تین میل دور ہے۔ آپؐ مہینوں وہاں جا کر قیام فرماتے اور غور و فکر اور اللہ کی عبادت میں مصروف رہتے۔ کھانے پینے کا سامان ساتھ لے جاتے۔ وہ ختم ہو جاتا تو گھر تشریف لاتے اور واپس جا کر پھر اللہ کی عبادت میں مشغول ہو جاتے۔ آپؐ غارِ حرا میں ہی تھے کہ خدا کی طرف سے پہلی وحی لے کر جبرائیلؑ نازل ہوئے اور کائنات کی رہنمائی کا کام آپؐ کے سپرد ہوا۔

اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلم

حضور صلی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ (القلم 4:68)

بے شک تم اخلاق حسنہ کے اعلیٰ درجے پر فائز ہو۔

قرآن کلام الٰہی ہے' جو خاتم الانبیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلم پر نازل ہوا۔ آپؐ کی ذات اس کا عملی نمونہ' اُسوہ اور نقشہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود کہا:

لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ (الاحزاب 20:33) تمھارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلم کی زندگی ہی بہترین اور کامل نمونہ ہے۔

قرآن حق وصداقت کا پیغام ہے اور آپؐ اس کے پیغام بر۔ قرآن رشد و ہدایت ہے اور آپؐ راشد و ہادی۔ اس لیے قرآن کی ہر آیت کسی نہ کسی طرح آپؐ کی ذات اقدس سے تعلق رکھتی ہے۔

ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے چند صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے عرض کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلم کے کچھ حالات زندگی ہمیں سنائیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا: کیا تم قرآن نہیں پڑھتے' جو خُلقِ نبیؐ کے بارے میں مجھ سے پوچھتے ہوئے۔ فَاِنَّ خُلُقَہٗ' کَانَ الْقُرۡاٰنُ آپؐ کی پوری اخلاقی زندگی قرآن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ قرآن نے جو کچھ کہا' محمد صلی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلم نے اسی کو کر دکھایا۔ گویا قرآن کا پڑھنا آپؐ کی حیات طیبہ ہی کو سامنے لانا ہے۔ یہاں آپؐ کے اخلاقِ کریمانہ کے چند گوشے اختصار کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔

1- سادگی اور بے تکلفی:

آنحضور صلی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلم اپنی روزمرہ کی زندگی میں حد درجہ سادہ تھے۔ مجلس سے اُٹھ کر گھر تشریف لے جاتے تو ننگے پاؤں چلے جاتے اور جوتے وہیں چھوڑ جاتے۔ یہ علامت تھی کہ آپؐ واپس تشریف لائیں گے۔

کھانے پینے' اُٹھنے بیٹھنے اور پہننے میں کوئی تکلف نہ فرماتے۔ سادہ سے سادہ کھانا کھا لیتے۔ آپؐ کے لیے آٹا چھانا نہ جاتا تھا۔ پہننے کو جیسا بھی مل جاتا پہن لیتے۔ زمین پر چٹائی کے فرش پر جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے۔ لباس میں نمائش پسند نہ فرماتے' سامانِ آرائش سے دُور رہتے اور ہر چیز میں سادگی اور بے تکلفی کو پیش نظر رکھتے۔ ناز و نعمت' تکلف اور عیش پسندی کو ناپسند فرماتے اور دوسروں کو بھی اس سے روکتے۔

جس طرح آپؐ خود سادگی پسند تھے۔ اسی طرح آپؐ یہ بھی چاہتے تھے کہ آپؐ کے اہل وعیال سادہ زندگی بسر کریں اور تکلف سے پاک رہیں۔ عورتوں کے لیے اگر چہ سونے کے زیور کا استعمال درست ہے مگر آپؐ اپنے گھر والوں کے لیے اسے بھی اچھا نہ سمجھتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے" کہ دُنیا میں انسان کے لیے اتنا کافی ہے جتنا ایک مسافر کو زادِ راہ کے لیے۔"

2- اپنا کام آپ کرنا:

آنحضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم اپنا کام خود اپنے ہاتھوں سے کرنا پسند فرماتے تھے۔ باوجودیکہ تمام صحابہؓ آپؐ کے جاں نثار اور آپؐ کے خادم تھے۔ آپؐ اپنے کام اپنے دست مبارک سے انجام دیا کرتے۔ ایک شخص نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ آپؐ گھر میں کیا کام کرتے تھے؟ جواب دیا کہ گھر کے کام کاج میں مصروف رہتے تھے۔ کپڑوں میں اپنے ہاتھ سے پیوند لگاتے' دُودھ دوہ لیتے' بازار سے سودا خرید لاتے' اونٹ کو اپنے ہاتھ سے باندھتے اور اسے چارا ڈالتے۔

جب آپؐ نوعمر تھے اور خانہ کعبہ تعمیر ہو رہا تھا تو اس وقت بھی پتھر اُٹھا اُٹھا کر معماروں کو دیتے۔ مسجد قبا اور مسجد نبوی کی تعمیر اور جنگ احزاب کے وقت مدینے کے گرد خندق کھودنے میں آپؐ نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر کام کیا۔ دو صحابیؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ دیکھا کہ خود اپنے دستِ مبارک سے مکان کی مرمت کر رہے ہیں۔ آپؐ کو لوگوں کی یہ عادت ناپسند تھی کہ خود بیٹھے رہیں اور دوسرے ان کے کام کریں۔

3- دوسروں کے کام آنا:

خبابؓ ایک صحابی تھے۔ وہ کسی جنگ پر گئے۔ ان کے گھر کوئی دُودھ دوہنے والا نہ تھا۔ آپؐ ہر روز ان کے گھر جاتے اور دُودھ دوہ دیا کرتے۔ حبش سے مہمان آئے تو صحابہ نے چاہا کہ وہ ان کی خدمت گزاری کریں لیکن آپؐ نے اسے اپنے ذمے لیا اور بہ نفسِ نفیس ان کی مہمان نوازی کا فرض انجام دیا۔ کوئی شخص بھی آتا اور کہتا ''یارسول ؐاللہ! میرا یہ کام ہے''۔ آپؐ فوراً اُٹھ کھڑے ہوتے اور اس کا کام کر دیتے۔ عبداللہؓ بن ابی اوفیٰ ایک صحابی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ''بیوہ اور مسکین کے ساتھ چل کر ان کا کام کر دینے میں آپ کو عار نہ تھا۔

4- بچوں پر شفقت:

بچوں پر حد درجہ مہربان تھے۔ سواری پر آ رہے ہوتے تو انھیں آگے پیچھے بٹھا لیتے۔ راستے میں بچوں سے ملتے تو انھیں پہلے سلام کرتے۔

ماں بچے کی محبت کے واقعات سن کر آپؐ پر گہرا اثر ہوتا تھا۔ ارشاد فرمایا کرتے کہ ''جس کے ذمے اللہ تعالیٰ اولاد کی پرورش کرے اور وہ ان کا حق بجالائے' وہ دوزخ سے محفوظ رہے گا۔'' آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم فرماتے تھے کہ ''میں نماز شروع کرتا ہوں اور ارادہ ہوتا ہے کہ دیر میں ختم کروں گا۔ اچانک کسی بچے کے رونے کی آواز آتی ہے اور نماز مختصر کر دیتا ہوں کہ اس کی ماں کو تکلیف ہوتی ہوگی۔''

بچوں کے لیے آپؐ کی محبت و شفقت صرف مسلمان بچوں تک محدود نہ تھی بلکہ مشرکین کے بچوں پر بھی لطف و کرم فرماتے۔ ایک غزوہ میں مشرکین کے چند بچے جھپٹ میں آ کر مارے گئے۔ آپؐ کو علم ہوا تو نہایت آزردہ ہوئے اور فرمایا: ''خبردار بچوں کو قتل نہ کرو' ہر جان خُدا کی فطرت پر ہی پیدا ہوتی ہے''۔

جب بھی خدمتِ اقدس میں کوئی نیا میوہ آتا تو حاضرین میں سب سے کم عمر بچے کو دیتے۔ بچوں کو چومتے اور انھیں پیار کرتے تھے۔

5- جانوروں پر رحم:

حیوانات پر رحم فرماتے۔عرب میں مدتوں سے ان بے زبانوں پر ظلم ہو رہا تھا۔آ پؐ نے اسے ختم کیا۔عرب زندہ جانور کے بدن سے گوشت کاٹ لیتے اور پکا کر کھاتے۔آ پؐ نے اس کو روکا۔جانور کی دم اور ایال کاٹنے سے منع فرمایا۔جانوروں کو باہم لڑانا ناجائز قرار دیا۔جانور کو باندھ کر اسے نشانہ بنانے کو ظلم قرار دیا اور اس سنگدلی سے لوگوں کو روکا۔پرندوں کے انڈے چرانے اور ان کے بچوں کو تکلیف پہنچانے سے منع فرمایا اور جانوروں کو بھوکا اور پیاسا رکھنے کے معاملے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حکم دیا۔

6- خادموں سے محبت:

آنحضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم خادموں اور غلاموں کے ساتھ خصوصیت سے شفقت فرماتے تھے۔آپؐ کا فرمان تھا کہ ''یہ تمھارے بھائی ہیں جو خود کھاتے ہو انھیں کھلاؤ' جو خود پہنتے ہو ان کو بھی پہناؤ''۔ایک بار یہ فرمایا کہ ''ان کو اتنا کام نہ دو جو وہ کر نہ سکیں۔اگر زیادہ کام دو تو خود بھی ان کی مدد کرو''۔غلاموں اور خادموں کو مارنے سے منع کیا اور نصیحت فرمائی کہ ان کی غلطیوں کو ہر روز اکثر معاف کیا کرو۔

7- حسن سلوک (ا) دشمنوں کے ساتھ:

انسانی اخلاق میں سب سے کمیاب اور نادر چیز دشمنوں پر رحم اور ان سے درگزر ہے۔دُشمن سے انتقام لینا اگرچہ انسان کا قانونی حق ہے' لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی ذات اقدس نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔دشمنوں سے انتقام کا سب سے بڑا موقع فتح مکہ کا دن تھا لیکن جب آنحضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے خون کے پیاسے سامنے آئے جنھوں نے آپؐ کو ہر طرح کی تکلیفیں دی تھیں تو آپؐ نے انھیں یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ ''تم پر کوئی ملامت نہیں' جاؤ تم سب آزاد ہو''

عکرمہ' اسلام کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل کے بیٹے تھے اور باپ کی طرح آنحضورؐ کے سخت دشمن تھے۔مکہ فتح ہوا تو بھاگ کر یمن چلے گئے۔ان کی بیوی مسلمان ہو چکی تھی۔وہ یمن گئیں اور عکرمہ کو تسلی دی۔انھیں مسلمان کیا اور لے کر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئیں۔آنحضورؐ نے دیکھا تو خوشی سے اُٹھے اور ان کی طرف اس تیزی سے بڑھے کہ جسم مبارک پر چادر تک نہ تھی اور زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے کہ ''اے ہجرت کرنے والے سوار! تیرا آنا مبارک ہو''۔

ابوسفیان فتح مکہ سے قبل اسلام کے خلاف جنگوں میں شامل رہے۔جب اس فتح کے موقع پر گرفتار کر کے آپؐ کے سامنے لائے گئے تو آپؐ محبت سے پیش آئے۔حتیٰ کہ ابوسفیان کے گھر کو دارالامان بنا دیا اور اعلان کیا کہ جو مشرک بھی ان کے گھر داخل ہو جائے گا وہ امان پائے گا۔

قریشِ مکہ کا ظلم کسے یاد نہیں۔مسلمان تین برس تک شعب ابی طالب میں محصور رہے۔غلے کا ایک دانہ اندر نہ پہنچ سکتا تھا۔بچے بھوک سے تڑپتے اور روتے تھے لیکن رحمت عالمؐ کو جب ان سے انتقام لینے کی طاقت نصیب ہوئی تو انھیں معاف فرما دیا۔

ہجرت سے قبل جب آپؐ تبلیغ اسلام کے لیے طائف گئے تو اہل طائف نے آپؐ کے ساتھ کیا کچھ سلوک نہیں کیا۔آپؐ پر پتھر

پھینکے حتیٰ کہ پائے مبارک لہولہان ہو گئے۔ فرشتۂ غیب نے پوچھا کہ ''حکم ہو تو ان پر پہاڑ الٹ دیا جائے'۔ جواب ملا کہ ''نہیں' شاید ان کی نسل سے کوئی خُدا کا پرستار پیدا ہو''۔ آپؐ نے ان کے حق میں ہمیشہ دُعا فرمائی کہ ''اے اللہ! اہلِ طائف کو اسلام نصیب فرما''۔

آپؐ اپنے جانی دشمنوں تک کے حق میں دعائے خیر فرماتے اور ان سے کوئی تعرض نہ فرماتے۔

حسن سلوک (ب) ساتھیوں اور گھر والوں کے ساتھ:

جو ذات دشمنوں کے ساتھ اس قدر اچھا سلوک رکھتی ہو وہ اپنے ساتھیوں یا گھر والوں کے ساتھ کب برا سلوک رکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنوں اور غیروں کے ساتھ جس حسن سلوک کا مظاہرہ آپؐ نے فرمایا' کائنات میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اہلِ بیتؓ ہوں یا صحابہ کرامؓ تمام آپؐ کے حُسنِ سلوک کے مدّاح نظر آتے ہیں۔

مساوات:

آپؐ کی نظر میں امیر و غریب' چھوٹا بڑا' آقا اور غلام سب برابر تھے۔ حضرت سلمان فارسی' حضرت صہیب رومی اور حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہم آپؐ کی بارگاہ میں قریش کے رئیسوں سے بلند مرتبہ تھے۔

ایک عورت چوری کے جرم میں پکڑی گئی۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ سے آنحضور صلی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلم کو حد درجہ محبت تھی۔ لوگوں نے انھیں آپؐ کے پاس اس عورت کا سفارشی بنا کر بھیجا۔ آپؐ نے فرمایا ''اسامہ! کیا خدا کے قانون میں سفارش کرتے ہو؟'' پھر آپؐ نے لوگوں کو جمع کر کے خطاب فرمایا ''تم سے پہلی امتیں اسی لیے برباد ہو گئیں کہ جب معزز آدمی کوئی جرم کرتا تو اسے چھوڑ دیا جاتا اور معمولی آدمی مجرم ہوتے تو سزا پاتے''۔

آپؐ مساواتِ نسلِ انسانی کے علمبردار تھے۔ صحابہؓ جب مل کر کوئی کام کرتے تو آپؐ بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتے۔ مسجد نبوی کی تعمیر میں آپؐ برابر کے شریک تھے۔ غزوۂ احزاب (جنگ خندق) کے موقع پر مدینہ کے گرد خندق کھودنے میں آپؐ نے بھی حصہ لیا۔

8- عزم و استقلال:

اسلام کے ایک ایک کارنامے سے آپؐ کا عزم و استقلال ظاہر ہوتا ہے۔ تیرہ برس کی مسلسل ناکامیوں کے باوجود آپؐ کی ذات مایوسی سے آشنا نہیں ہوئی۔ ہجرت سے قبل ایک بار صحابہؓ نے مشرکوں کی ایذا رسانیوں سے تنگ آ کر خدمت مبارک میں عرض کی کہ ''آپؐ ہمارے لیے کیوں دُعا نہیں فرماتے۔'' ''یہ سن کر آپؐ کا چہرہ مبارک غصّے سے سُرخ ہو گیا اور فرمایا: تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں' ان کو آرے سے چیر کر دو ٹکڑے کر دیا جاتا اور ان کے بدن پر لوہے کی کنگھیاں چلائی جاتی تھیں لیکن یہ آزمائشیں انھیں مذہب سے برگشتہ نہ کر سکیں۔ خُدا کی قسم اسلام اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ کر رہے گا۔''

قریشِ مکہ تبلیغِ اسلام کے خلاف ہر قسم کی تدبیروں سے تھک گئے۔ آپؐ کے سامنے حکومت' خزانہ اور حسن کی پیشکش کی گئی تو آپؐ نے نہایت حقارت سے ان کی درخواست کو ٹھکرا دیا۔ بالآخر جب آپؐ کے چچا ابو طالب نے مشرکین کے خطرناک ارادے پیش کیے تو یہ

آپؐ کے عزم و استقلال کا آخری امتحان تھا۔ اس کے جواب میں آپؐ نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ ہمت و استقلال کا بہترین اظہار ہے۔
فرمایا: چچا جان! اگر قریش میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں، تب بھی اپنے اعلانِ حق سے باز نہ آؤں گا''۔

اسلام کے خلاف کفار کے تمام معرکوں میں آپؐ نے جس ثابت قدمی، پامردی، عزم و استقلال اور بہادری کا ثبوت دیا، وہ ایک پیغمبر برحق کے شایانِ شان ہی ہوسکتا ہے۔ آنحضورؐ کو سینکڑوں مصائب و خطرات اور بیسیوں معرکے اور غزوات پیش آئے لیکن کبھی پامردی اور ثابت قدمی نے لغزش نہیں کھائی۔

سوالات

1- منصبِ رسالت اور اس کی عظمت پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔
2- مندرجہ ذیل انبیاء کرامؑ کی تبلیغی کوششوں پر مختصر نوٹ لکھیے۔
حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام۔
3- پیغامِ حق کی اشاعت کے سلسلہ میں نبی کریمؐ کو مکہ میں کیا مشکلات پیش آئیں۔
4- مدینہ منورہ میں اشاعتِ اسلام پر نوٹ تحریر کیجیے۔
5- حضور صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کے اعلیٰ اخلاق پر مضمون لکھیں۔
6- آنحضرت صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم تمام رسولوںؑ اور نبیوںؑ کے سردار ہیں۔ وضاحت کیجیے۔
7- رسول اور پیغمبر کے اوصاف بیان کیجیے۔ نیز ختمِ نبوت پر نوٹ لکھیے۔
8- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت پر مختصر نوٹ لکھیے۔
9- رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کو عوامی حمایت سے محروم کرنے کے لیے قریش نے کیا ہتھکنڈے استعمال کیے؟
10- اہلِ طائف نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کو دعوتِ حق کی پاداش میں جس ظلم و ستم کا نشانہ بنایا اس کی تفصیل بیان کیجیے۔

باب پنجم

عربی زبان کی گرامر

کلمہ

اکیلے بامعنیٰ لفظ کو کلمہ کہتے ہیں جیسے: قُرْاٰن'' کِتاب'' جَاءَ (آیا) اِلیٰ (طرف)(تک)

کلمہ کی تین قسمیں ہیں: اسم' فعل' حرف

اسم وہ کلمہ ہے جو کسی انسان' حیوان یا چیز کا نام ہو جیسے:

طَارِق'' . اَسَد'' (شیر) زَھْرَۃ'' (پھول) قَلَم''

فعل وہ کلمہ ہے جس میں کسی کام کا ہونا یا کرنا کسی نہ کسی زمانے میں پایا جائے۔ جیسے:

جَاءَ : (آیا)۔ اَکَلَ : (کھایا)۔ یَدْخُلُ : (داخل ہوتا ہے) سَاَذْھَبُ : (میں جاؤں گا)

حرف وہ کلمہ ہے جو اسم یا فعل کے ساتھ ملے بغیر استعمال نہ ہوتا ہو جیسے: مِنْ : (سے) اِلیٰ : (تک) عَلیٰ (پر) ھَلْ : (کیا)۔

(یہ تمام الفاظ اکیلے استعمال نہیں ہوتے)۔

اسم نکرہ و اسم معرفہ

اسم نکرہ:

جو کسی خاص چیز کا نام نہ ہو بلکہ ایک ہی قسم کی کئی چیزوں کا نام ہو۔ جیسے

کِتَاب''. رَجُل'': (مرد) جَمَل'' : (اونٹ)

اسم معرفہ:

جو خاص چیز کا نام ہو۔ جیسے

قُراٰنٌ. مُحَمَّدٌ. فَاطِمَۃُ. عَائِشَۃُ.

اسم نکرہ پر الف لام (ال) لگا دیا جائے تو وہ اسم معرفہ بن جاتا ہے۔

الف لام جب داخل ہو تو اسم نکرہ کی تنوین بھی گر جاتی ہے۔ جیسے:

تِلْمِیْذٌ سے اَلتِّلْمِیْذُ (خاص شاگرد)

بَیْت'' سے اَلْبَیْتُ (خاص مکان)

مذکرومؤنّث

مذکر:

وہ اسم ہے جوانسان، حیوان یاکسی اور چیز کے نرکوظاہر کرے۔ جیسے

اَب" (باپ) رَجُل" (مرد)اَسَد" (شیر)

جن اسماء میں نراور مادہ نہیں ہوتے وہاں اسم مذکر وہ ہوگا جس میں مونث کی کوئی علامت نہ پائی جائے جیسے قَلَمٌ. کِتَابٌ. کُرُسِیٌّ

مونث:

وہ اسم ہے جوانسان، حیوان یاکسی اور چیز کی مادہ کوظاہر کرے جیسے:

اُمّ" (ماں) اُختٌ (بہن) دَجَاجَۃٌ (مرغی) طَاوِلَۃٌ (میز)

مؤنث لفظی ومؤنث معنوی

مؤنث لفظی:

وہ ہے جس کے آخر میں علامات مؤنث میں سے کوئی علامت موجود ہو۔

علامات مؤنث

ا: تائے مربوطہ زائدہ: جیسے دَجَاجَۃٌ. دَرَّاجَۃٌ (سائیکل)

ب: الف مقصورہ زائدہ: جیسے صُغْرٰی. کُبْرٰی. عَطْشٰی (پیاسی)

ج: الف ممدودہ زائدہ: جیسے سَوْدَاءُ. (سیاہ) حَمْرَاءُ (سرخ)

مؤنث معنوی:

وہ ہے جس میں مذکورہ بالا علامات مؤنث میں سے کوئی علامت نہ پائی جائے۔ ویسے مؤنث کے لیے استعمال ہو۔ جیسے: اُخْتٌ. اُمّ. زَیْنَبُ. کُلْثُوْمُ

نوٹ: قبیلوں اور ممالک کے نام مؤنث معنوی ہیں۔ جیسے

مُلْتَانُ. بَاکِسْتَانُ. قُرَیْش". اوراسی طرح وہ اعضاء جو دو دو ہیں، ان میں اکثر مؤنث معنوی ہیں۔ جیسے یَد" (ہاتھ)۔ عَیْن" (آنکھ) رِجل" (پاؤں وغیرہ)

مفرد، تثنیہ، جمع

مفرد: وہ اسم ہے جو ایک چیز کو ظاہر کرے۔ جیسے: قَلَم" (ایک قلم) بِنت" (ایک لڑکی) اَسَد" (ایک شیر) مِصبَاح" (ایک لیمپ)

تثنیہ: وہ اسم ہے جو دو چیزوں کو ظاہر کرے۔ جیسے قَلَمَانِ (دو قلم) تِلمِیذَانِ (دو طالب علم) مِصبَاحَانِ (دو لیمپ)

تثنیہ بناتے وقت مفرد کے آخر میں الف و نون مکسورہ (انِ) لگایا جاتا ہے۔ جب اسم تثنیہ پر پیش کی جگہ زبر یا زیر پڑھنی ہو تو الف یائے ساکنہ سے بدل جاتا ہے جیسے: قَلَمَینِ. تِلمِیذَینِ. مِصبَاحَینِ.

جمع: وہ اسم ہے جو دو سے زیادہ چیزوں کو ظاہر کرے۔ جیسے: اَقلَام". بَنَات"۔ (لڑکیاں) مَصَابِیحُ. مُسلِمُونَ. صَادِقُونَ. عَابِدَات"

جمع کی قسمیں

جمع مکسر و جمع سالم

جمع مکسر:

وہ جمع ہے جو مفرد میں کچھ تبدیلی کر کے بنائی جائے جیسے:

قَلَم" سے اَقلَامٌ. مِصبَاحٌ سے مَصَابِیحُ. رِجلٌ (پاؤں) سے اَرجُلٌ. کِتَابٌ سے کُتُبٌ.

جمع سالم:

وہ ہے جس کے بناتے وقت مفرد میں تبدیلی واقع نہ ہو، بلکہ علامت جمع آخر میں لگا دی جاتی ہے جیسے: صَادِقٌ سے صَادِقُونَ. مُؤمِنَةٌ سے مُؤمِنَاتٌ

جمع سالم کی قسمیں

جمع مذکر سالم و جمع مؤنث سالم

جمع مذکر سالم: وہ ہے جس میں مفرد مذکر کے آخر میں علامت جمع واؤ ساکنہ و نون مفتوحہ (وْ نَ) لگائی جاتی ہے جیسے: مُسلِمٌ سے مُسلِمُونَ. قَانِتٌ سے قَانِتُونَ. مَنصُورٌ سے مَنصُورُونَ.

جمع مذکر سالم پر اگر پیش کی جگہ زبر یا زیر پڑھنی ہو تو دونوں صورتوں میں واؤ ساکنہ کو یائے ساکنہ سے بدل دیتے ہیں۔ جیسے، مُسلِمِینَ. مَنصُورِینَ.

جمع مؤنث سالم: وہ ہے جس میں مفرد مؤنث کے آخر میں علامت جمع الف و تاء (ات) لگائی جاتی ہے۔ جیسے: مُؤمِنَةٌ سے

مُؤْمِنَاتٌ. سَاجِدَةٌ سے سَاجِدَاتٌ

مفرد میں اگر علامت مؤنث تائے مربوطہ(ۃ) ہو تو جمع کے وقت وہ گرا دی جاتی ہے۔

جمع مؤنث سالم پر اگر پیش کی جگہ زبر یا زیر پڑھنی ہو تو دونوں صورتوں میں زیر ہی پڑھی جاتی ہے، زبر نہیں پڑھی جاتی۔ جیسے :

مُسْلِمَاتٍ. عَابِدَاتٍ.

ضمائر

اسم ضمیر وہ اسم معرفہ ہے جو غائب، مخاطب یا متکلم پر دلالت کرے۔ جیسے هُوَ (وہ مرد) هِيَ (وہ عورت) اَنْتَ (تو ایک مرد) اَنَا (میں)

اسم ضمیر کی قسمیں

1-اسم ضمیر متصل۔ 2-اسم ضمیر منفصل

ضمیر متصل وہ ہے جو کسی فعل، اسم یا حرف کے ساتھ مل کر استعمال ہو جیسے قَرَأْتُ (میں نے پڑھا) خَرَجْنَا (ہم نکلے) سَاعَتُكَ (تیری گھڑی) عَلَيْنَا (ہم پر) یہاں (تُ) .(نَا) (کَ) (نَا) سب ضمائر متصل ہیں۔

ضمیر منفصل وہ ہے جو الگ استعمال ہو، جیسے: هُوَ (وہ) اِيَّاكَ (تجھے) نَحْنُ (ہم)

اسم ضمیر متصل کی قسمیں

مرفوع، منصوب، مجرور

ضمیر متصل مرفوع (فاعلی ضمیر) وہ ہے جو فعل کے ساتھ مل کر بطور فاعل محلاً مرفوع استعمال ہو۔ جیسے سَمِعْنَا (ہم نے سنا) اَكَلَتْ (اس عورت نے کھایا) شَرِبْتُمْ (تم نے پیا) كَتَبْنَ (ان سب عورتوں نے لکھا)

ضمیر متصل منصوب (مفعولی ضمیر) وہ ہے جو کسی فعل کے ساتھ مل کر بطور مفعول یا کسی حرف کے ساتھ مل کر بطور مفعول محلاً منصوب استعمال ہو جیسے عَلَّمَنِيْ (اس نے مجھے سکھایا) اِرْحَمْنَا (ہم پر رحم فرما) اِنَّهٗ (بے شک وہ) لَيْتَنِيْ (کاش کہ میں)

ضمیر متصل مجرور (اضافی ضمیر) وہ ہے جو کسی اسم کا مضاف الیہ یا کسی حرف جار کا معمول بن کر محلاً مجرور استعمال ہو۔ جیسے كِتَابِيْ (میری کتاب) اَخُوْكَ (تیرا بھائی) لَهَا (اس کے لیے) عَلَيْكُمْ (تم پر)

نوٹ: اسمائے ضمیر موقع و محل کے مطابق اعراب قبول نہیں کرتے۔ انھیں مرفوع، منصوب یا مجرور محلاً کہا جاتا ہے یعنی ان کی جگہ کوئی اور اسم معرب ہوتا تو وہ مرفوع، منصوب یا مجرور ہوتا۔

اسم ضمیر منفصل کی قسمیں

مرفوع۔ منصوب

ضمیر منفصل مرفوع وہ ہے جو مسند الیہ بن کر الگ استعمال ہو۔ جیسے هُوَ صَادِقٌ (وہ سچا ہے) اَنَا تِلْمِيْذٌ (میں طالب علم ہوں) هِيَ اُمِّيْ (وہ میری ماں ہے) هُمْ رِجَالٌ (وہ سب مرد ہیں)

ضمیر منفصل منصوب وہ ہے جو کسی فعل کا مفعول بن کر الگ استعمال ہو۔ جیسے اِيَّاكَ نَعْبُدُ (ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں)

ضمیر مرفوع منفصل

	غائب مذکر	غائب مؤنث	مخاطب مذکر	مخاطب مؤنث
واحد	هُوَ	هِيَ	اَنْتَ	اَنْتِ
تثنیہ	هُمَا	هُمَا	اَنْتُمَا	اَنْتُمَا
جمع	هُمْ	هُنَّ	اَنْتُمْ	اَنْتُنَّ

	متکلم مذکر و مؤنث
واحد	اَنَا
تثنیہ و جمع	نَحْنُ

فعل کی قسمیں

فعل ماضی، فعل مضارع، فعل امر

فعل ماضی وہ فعل ہے جس میں کسی کام کا گزرے ہوئے زمانے میں واقع ہونا سمجھا جائے جیسے: قَرَأَ (اس نے پڑھا) دَخَلَ (وہ داخل ہوا)۔ خَرَجَ (وہ نکلا) اَكَلَ (اس نے کھایا) شَرِبَ (اس نے پیا) سَمِعَ (اس نے سنا) كَتَبَ (اس نے لکھا)

نوٹ: کوئی فعل فاعل کے بغیر سرزد نہیں ہوتا۔ فاعل کبھی اسم ظاہر اور کبھی اسم ضمیر ہوتا ہے۔ جب فاعل اسم ضمیر ہو تو فعل کے عربی میں چودہ صیغے استعمال ہوتے ہیں تاکہ فاعل کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ آیا وہ غائب ہے، مخاطب ہے یا متکلم ہے، پھر کیا وہ مذکر ہے یا مؤنث؟ اسی طرح وہ واحد ہے تثنیہ ہے یا جمع۔ یہ صیغے فاعل کا تعین کرنے کے لیے لائے جاتے ہیں جیسا کہ نقشے سے ظاہر ہے۔

فعل ماضی مطلق

	غائب مذکر	غائب مؤنث
واحد	کَتَبَ (اس نے لکھا)	کَتَبَتْ (اس ایک عورت نے لکھا)
تثنیہ	کَتَبَا (ان دو مردوں نے لکھا)	کَتَبَتَا (ان دو عورتوں نے لکھا)
جمع	کَتَبُوْا (ان سب مردوں نے لکھا)	کَتَبْنَ (ان سب عورتوں نے لکھا)
	مخاطب مذکر	**مخاطب مؤنث**
واحد	کَتَبْتَ (تو نے لکھا)	کَتَبْتِ (تو ایک عورت نے لکھا)
تثنیہ	کَتَبْتُمَا (تم دونوں نے لکھا)	کَتَبْتُمَا (تم دو عورتوں نے لکھا)
جمع	کَتَبْتُمْ (تم سب نے لکھا)	کَتَبْتُنَّ (تم سب عورتوں نے لکھا)

متکلم مذکر و مؤنث

واحد	کَتَبْتُ (میں (ایک مرد یا ایک عورت) نے لکھا)
تثنیہ و جمع	کَتَبْنَا (ہم دو یا سب (مردوں یا عورتوں) نے لکھا)

فعل مضارع وہ فعل ہے جس میں کسی کام کا زمانہ حال یا مستقبل میں واقع ہونا سمجھا جائے۔ جیسے: یَقْرَأُ (وہ پڑھتا ہے یا پڑھے گا) یَدْخُلُ (وہ داخل ہوتا ہے یا داخل ہوگا) یَسْمَعُ (وہ سنتا ہے یا سنے گا)

فعل مضارع میں بھی فاعل جب اسم ضمیر ہو تو فعل ماضی کی طرح چودہ شکلیں استعمال ہوتی ہیں۔ نقشہ دیکھیے۔

فعل مضارع

	غائب مذکر	غائب مؤنث
واحد	یَکْتُبُ (وہ ایک مرد لکھتا ہے یا لکھے گا)	تَکْتُبُ (وہ ایک عورت لکھتی ہے یا لکھے گی)
تثنیہ	یَکْتُبَانِ (وہ دو مرد لکھتے ہیں یا لکھیں گے)	تَکْتُبَانِ (وہ دو عورتیں لکھتی ہیں یا لکھیں گی)
جمع	یَکْتُبُوْنَ (وہ سب مرد لکھتے ہیں یا لکھیں گے)	یَکْتُبْنَ (وہ سب عورتیں لکھتی ہیں یا لکھیں گی)
	مخاطب مذکر	**مخاطب مؤنث**
واحد	تَکْتُبُ (تو ایک مرد لکھتا ہے یا لکھے گا)	تَکْتُبِیْنَ (تو ایک عورت لکھتی ہے یا لکھوگی)
تثنیہ	تَکْتُبَانِ (تم دو مرد لکھتے ہو یا لکھوگے)	تَکْتُبَانِ (تم دو عورتیں لکھتی ہو یا لکھوگی)
جمع	تَکْتُبُوْنَ (تم سب مرد لکھتے ہو یا لکھوگے)	تَکْتُبْنَ (تم سب عورتیں لکھتی ہو یا لکھوگی)

متکلم مذکر ومؤنث

واحد	اَکْتُبُ	میں (ایک مرد یا ایک عورت) لکھتا ہوں یا لکھوں گا۔
تثنیہ وجمع	نَکْتُبُ	ہم دو یا سب (مرد یا عورتیں لکھتے ہیں یا لکھیں گے۔)

فعل امر

فعل امر وہ فعل ہے جس میں کسی کو حکم دیا جانا یا کسی سے التجا وغیرہ کرنا سمجھا جائے۔ جیسے: اُکْتُبْ (تو لکھ) اُخْرُجْ (تو نکل جا) اِسْمَعْ (تو سن) اِشْرَبْ (تو پی) اِرْحَمْ (تو رحم فرما) اِغْفِرْ (تو بخش دے)

فعل امر حاضر میں فاعل، اسم ضمیر صرف مخاطب ہوتا ہے اس لیے اس کی کل چھ شکلیں (صیغے) استعمال ہوتے ہیں۔

	مخاطب مذکر		مخاطب مؤنث	
واحد	اُکْتُبْ	تو ایک مرد لکھ	اُکْتُبِی	تو ایک (عورت) لکھ
تثنیہ	اُکْتُبَا	تم دو (مرد) لکھو	اُکْتُبَا	تم دو (عورتیں) لکھو
جمع	اُکْتُبُوْا	تم سب (مرد) لکھو	اُکْتُبْنَ	تم سب (عورتیں) لکھو

نوٹ: طلبہ کو گردانیں یاد کرانا مقصود نہیں۔ صرف فعل کے مختلف صیغوں کی پہچان بذریعہ گردان کافی ہے۔ گردانیں صرف سہولت کی خاطر لکھی گئی ہیں تاکہ طلبہ مختلف شکلوں سے آگاہ ہو جائیں۔

مرکب

مرکب وہ ہے جو کم از کم دو کلموں سے مل کر بنے جیسے:

عَبْدُاللّٰهِ. وَلَدٌ نَظِيْفٌ. اَللّٰهُ خَالِقٌ. ذَهَبَ خَالِدٌ

مرکب کی قسمیں

مرکب ناقص۔ مرکب تامّ

مرکب ناقص وہ ہے جس سے مکمل بات سمجھ میں نہ آئے۔ جیسے:

كِتَابُ الْوَلَدِ (بچے کی کتاب) بُسْتَانٌ جَمِيْلٌ (خوبصورت باغ) مرکب تامّ وہ ہے جس سے مکمل بات سمجھ میں آ جائے۔ جیسے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ. اَللّٰهُ رَحِيْمٌ. جَاءَ طَارِقٌ. (طارق آیا) مرکب تام کو جملہ بھی کہتے ہیں۔

مرکب ناقص کی قسمیں

مرکب ناقص کی ویسے تو بہت سی قسمیں ہیں مگر یہاں صرف مرکب اضافی اور مرکب توصیفی کے بارے میں کچھ وضاحت کی جائے گی۔

مرکب اضافی:۔ وہ مرکب ناقص جو مضاف اور مضاف الیہ سے مل کر بنے مرکب اضافی کہلاتا ہے جیسے: عَبْدُاللّٰہِ. قَلَمُ الْبِنْتِ (لڑکی کا قلم) کِتَابُ الْوَلَدِ (لڑکے کی کتاب) اِبْنُ خَالِدٍ (خالد کا بیٹا)

(ا) عربی میں مضاف پہلے اور مضاف الیہ بعد میں آتا ہے۔

(ب) مضاف ہمیشہ نکرہ اور مضاف الیہ ہمیشہ معرفہ ہوتا ہے۔

(ج) مضاف الیہ کے نیچے ہمیشہ زیر پڑھی جاتی ہے جیسا کہ مثالوں سے ظاہر ہے۔

مرکب توصیفی:۔ وہ مرکب ناقص جو صفت اور موصوف سے مل کر بنے مرکب توصیفی کہلاتا ہے۔ جیسے وَلَدٌ نَطِیْفٌ (صاف ستھرا بچہ) رِجَالٌ صَادِقُوْنَ (سچے مرد) نِسَاءٌ عَابِدَاتٌ (عبادت گزار عورتیں) کِتَابٌ جَیِّدٌ (عمدہ کتاب) اَلْعَبْدُ الصَّالِحُ (نیک بندہ) اَلْبَیْتُ الْوَاسِعُ (کھلا مکان)

عربی زبان میں موصوف پہلے اور صفت بعد میں آتی ہے۔ صفت اپنے موصوف کے ساتھ تذکیر و تانیث' تعریف و تنکیر اور واحد تثنیہ جمع ہونے میں پوری مطابقت رکھتی ہے۔

مرکب تامّ (جملہ) کی قسمیں

جملہ اسمیہ' جملہ فعلیہ

جملہ اسمیہ: وہ جملہ ہے جس کا پہلا جز و اسم ہو جیسے اَللّٰہُ غَفُوْرٌ. اَلْقُراٰنُ کِتَابٌ. اَلْاِمْرَأَۃُ جَالِسَۃٌ (عورت بیٹھی ہوئی ہے) طَارِقٌ شَرِیْفٌ. زَیْنَبُ عَابِدَۃٌ (زینب عبادت گزار ہے)

جملہ اسمیہ کے پہلے جز و کو مسند الیہ اور مبتدا اور دوسرے کو مسند اور خبر کہتے ہیں۔

مبتدا ہمیشہ معرفہ اور خبر نکرہ ہوتی ہے۔ خبر مبتدا کے ساتھ تذکیر و تانیث اور واحد جمع ہونے میں مطابقت رکھتی ہے۔ مبتدا اور خبر دونوں پر پیش پڑھا جاتا ہے۔ (اوپر کی مثالیں دیکھیے)

جملہ فعلیہ: وہ جملہ ہے جس کا پہلا جز و فعل ہو جیسے ذَھَبَ زَیْدٌ'' (زید چلا گیا) قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا) جَاءَ الْحَقُّ (حق آ گیا) اَکَلَ خَالِدٌ طَعَامًا (خالد نے کھانا کھایا) شَرِبَ زَیْدٌ'' مَاءً (زید نے پانی پیا)

جملہ فعلیہ میں پہلے جز و کو مسند اور فعل کہتے ہیں اور دوسرا جز و مسند الیہ اور فاعل کہلاتا ہے۔ جملہ فعلیہ میں بعض اوقات مفعول بھی آ جاتا ہے جبکہ فعل متعدی استعمال ہو۔ فاعل پر ہمیشہ پیش اور مفعول بہٖ پر زَبر پڑھی جاتی ہے۔ فاعل ہمیشہ معرفہ اور مفعول بہٖ کبھی معرفہ اور کبھی نکرہ ہوتا ہے۔ (مثالیں دیکھیے)

فعل لازم' فعل متعدی

فعل لازم وہ فعل ہے جس کو مفعول بہٖ کی ضرورت نہ ہو اور فاعل پر بات ختم ہو جائے۔ جیسے جَاءَ طَارِقٌ (طارق آیا) ذَھَبَ خَالِدٌ (خالد چلا گیا) اِنْشَقَّ الْقَمَرُ (چاند دو ٹکڑے ہو گیا) نَزَلَ الْمَطَرُ (بارش برسی)

فعل متعدی وہ فعل ہے جسے فاعل کے علاوہ مفعول بہٖ کی ضرورت ہو، اور مفعول بہٖ کا ذکر کیے بغیر بات مکمل نہ ہو۔ جیسے شَرِبَ خَالِدٌ مَاءً (خالد نے پانی پیا) قَتَلَ دَاؤدُ جَالُوْتَ (داؤد نے جالوت کو قتل کیا) قَرَءَ عَلِیّ'' کِتَاباً (علی نے کتاب کو پڑھا)

فعل معروف و فعل مجہول

فعل معروف وہ فعل ہے جس کا فاعل معلوم ہو۔ جیسے خَرَجَ زَیْد'' (زید نکلا) کَتَبْتُ (میں نے لکھا) اَنْزَلَ اللّٰهُ الْقُراٰنَ (اللہ نے قرآن نازل کیا)

فعل مجہول وہ فعل ہے جس کا فاعل معلوم نہ ہو جیسے: رُزِقْنَا (ہمیں رزق دیا گیا) یُقْتَلُوْنَ (وہ قتل کیے جاتے ہیں) شُرِبَ مَاءٌ (پانی پیا گیا)

حروف

1- واو: کئی معنوں میں استعمال ہوتی ہے مگر اس کا زیادہ استعمال دو معنوں میں ہوتا ہے: قسم، عطف۔

قَسَم: . جب واؤ قسم کے لیے ہو تو یہ اسم کو زیر دے گی۔

وَاللّٰهِ (خدا کی قسم) وَالْقُراٰنِ (قرآن مجید کی قسم)

عطف: . دو یا دو سے زائد اسموں کو ایک فعل کے تحت لانے کو عطف کہتے ہیں۔ حروف عطف بہت سے ہیں۔ ان میں ایک ''واو'' ہے۔ جب عطف واؤ سے ہو تو ترتیب شرط نہیں۔

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ (میں اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا) جَاءَ زَیْدٌ وَبَکْرٌ وَ خَالِدٌ (زید، بکر اور خالد آئے)

2- فَا: . (حرف عطف ہے لیکن اس میں فوری ترتیب شرط ہے۔

جَاءَ جَمِیْل'' فَالْاَمِیْرُ (پہلے جمیل اور پھر امیر آیا)

سَلَّمْتُ عَلٰی أَبِیْ فَاُمِّیْ (پہلے میں نے اپنے باپ کو سلام کیا پھر ماں کو)

3- ثُمَّ: . (حرف عطف ہے لیکن اس کی ترتیب میں کچھ فاصلہ شرط ہے۔

ذَهَبْتُ اِلَی الْمَدْرَسَةِ ثُمَّ الْبُسْتَانِ (میں مدرسے گیا اور کچھ وقفہ کے بعد باغ میں گیا)

رَأَیْتُ الْاَسَدَ ثُمَّ الْقِرْدَ (میں نے شیر دیکھا اور کچھ وقت کے بعد بندر دیکھا)

4- بَا: . معنیٰ ''ساتھ''۔ یہ ان حروف میں سے ہے جو اسم کو زیر دیتے ہیں:

بِسْمِ اللّٰهِ (اللہ کے نام کے ساتھ) کَتَبْتُ بِالْقَلَمِ (میں نے قلم کے ساتھ لکھا)

لِ، مِنْ، اِلٰی، فِیْ، عَلٰی:

یہ حروف جارہ ہیں۔ اسم کو زیر دیتے ہیں، لیکن ان کے معانی مختلف ہیں۔

لِ: کا معنیٰ ''کے لیے'' ہے۔

لِلّٰهِ (اللّٰہ کے لیے)لِلرَّسُوْلِ (رسولؐ کے لیے)اَلنَّارُ لِلْکٰفِرِیْنَ (دوزخ کافروں کے لیے ہے)اَلْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِیْنَ (جنت پرہیزگاروں کے لیے ہے)۔اَلْقَلَمُ لِلْکِتَابَةِ (قلم لکھنے کے لیے ہے)

مِنْ:. کا معنیٰ ''سے''،'' کی طرف سے'' ہے۔

اَلْقُرْاٰنُ مِنَ اللّٰهِ (قرآن اللہ کی طرف سے ہے)مِنَ الْمَدِیْنَةِ (مدینہ سے)قَطَفْتُ الْوَرْدَةَ مِنَ الْحَدِیْقَةِ (میں نے گلاب کا پھول باغیچے سے چنا)

اِلیٰ:. کا معنیٰ ''تک یا کی طرف'' ہے۔

مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا (مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک) سِرْتُ مِنَ الْمَدِیْنَةِ اِلیٰ مَکَّةَ (میں مدینہ منوّرہ سے مکہ معظّمہ تک چلا)اِلَی الْمَدْرَسَةِ (مدرسہ کو یا کی طرف)

فِیْ: . کا معنیٰ ''میں،اندر'' ہے۔

فِی الْقُرْاٰنِ (قرآن میں) فِی الْمَدْرَسَةِ مُعَلِّمٌ (مدرسہ میں استاد ہے)،فِی الْکِتَابِ عِلْمٌ (کتاب میں علم ہے)فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (ان کے دلوں میں مرض ہے۔)

عَلیٰ:. کا معنیٰ ''پر،اوپر'' ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ (اللہ نے مومنوں پر احسان کیا ہے) تَوَکَّلْ عَلَی اللّٰهِ (اللہ پر بھروسہ رکھ)اَنْزَلَ اللّٰهُ الْقُراٰنَ عَلیٰ رَسُوْلِهٖ (اللہ نے اپنے رسولؐ پر قرآن نازل کیا)

ہمزۂ استفہام(أ) هَلْ،مَا، مَنْ:.

یہ کلمات استفہام ہیں۔ان کے ذریعے سوال کیا جاتا ہے،لیکن ان کا استعمال مختلف ہے۔

ہمزۂ استفہام:(أ) کیا:

یہ ہمزہ جملہ اسمیہ اور فعلیہ دونوں قسم کے جملوں پر داخل ہوتا ہے خواہ وہ جملہ مثبت ہو یا منفی،اور اس کا جواب ''ہاں''نَعَمْ یا ''نہیں''لَا سے دیا جاتا ہے۔

أَجَاءَ زَیْدٌ'' ؟ (کیا زید آیا؟) أَ اَنْتَ خَالِدٌ'' (کیا تو خالد ہے؟)

أَصَلَّیْتَ ؟ (کیا تو نے نماز پڑھی ہے؟) أَلَاتَذْهَبُ اِلَی الْمَدْرَسَةِ؟ (کیا تو مدرسہ نہیں جائے گا؟)

هَلْ (کیا)

یہ صرف مثبت جملے پر داخل ہوتا ہے۔خواہ وہ جملہ اسمیہ ہو یا فعلیہ،اور اس کا جواب بھی ''ہاں''نَعَمْ یا ''نہیں''لَا سے دیا جاتا ہے۔

هَلْ اَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ؟ (کیا تم مسلمان ہو)هَلْ جَاءَ الْمُعَلِّمُ؟ (کیا استاد آیا ہے؟)هَلْ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ (کیا تو اللہ،اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتا ہے؟)

مَنْ:۔ (کون، کس)

مَنْ وہ اسم استفہام ہے جو ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

مَنْ اَنْتَ؟ (تو کون ہے؟) مَنْ ھٰذَاالرَّجُلُ؟ (یہ مرد کون ہے؟)

مَنْ مُعَلِّمُکُمْ؟ (تمھارا اُستاد کون ہے؟) مَنْ رَبُّکُمْ؟ (تمھارا رَبّ کون ہے؟) مَنْ نَبِیُّکُمْ (تمھارا نبی کون ہے؟) مَنْ ضَرَبَکَ؟ (تجھے کس نے مارا؟)

مَنْ:۔ ''جو'' اور ''جس'' کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ تو اس وقت اس کو ''مَن موصولہ'' کہتے ہیں۔

مَنْ لَّمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہ (جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللّٰہ کا شکر بھی ادا نہیں کرتا)

مَنْ لَّا یَرْحَمُ لَا یُرْحَمُ (جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا)

لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ مَنْ فِیْ قَلْبِہٖ مِثْقَالُ ذَرَّۃٍ مِّنْ کِبْرٍ (وہ جنت میں داخل نہ ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہو)

مَا (کیا)

مَا وہ اسم استفہام ہے جو غیر ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

مَاھٰذا؟ (یہ کیا ہے؟) مَافِیْ یَدِکَ؟ (تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟) مَاقِبْلَتُکُمْ؟ (تمھارا قبلہ کیا ہے؟)

مَا نفی (نہیں) کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے تو اس وقت اس کو مَا نافیہ کہتے ہیں اور اس وقت وہ اسم نہیں بلکہ حرف ہوتا ہے۔

مَاکَانَ مُحَمَّد'' اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ (محمد صلی اللّٰہ علیہ واٰلہٖ وسلم تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں)

مَا اٰمَنَ بِیْ مَنْ بَاتَ شَعْبَانَ وَجَارُہٗ جَائِع'' (الحدیث)

(اس کا مجھ پر ایمان نہیں ہے جو سیر ہو کر رات کو سو گیا اور اس کا پڑوسی بھوکا رہا)

سوالات

1- کلمہ، حرف، اسم نکرہ اور اسم معرفہ کی تعریف کیجیے اور مثالوں سے اپنے جواب کی وضاحت کیجیے۔

2- اسم ضمیر کی اقسام بیان کیجیے اور مثالیں دیجیے۔

3- مرکب ناقص اور مرکب تامّ کی قسمیں بیان کریں۔

4- ھَلْ، مَا، مَنْ کا استعمال مع امثلہ وضاحت سے لکھیں۔

5- فعل کی اقسام بیان کیجیے نیز ''یَکْتُبُ'' سے فعل مضارع کی گردان لکھیے۔